فقہ احمدیہ

مشتمل بر احکامِ شخصیّہ (پرسنل لاء)

نکاح ــــ طلاق ــــ خُلع ــــ وراثت

شائع کردہ

اِدارۃُ المُصنّفین ربوہ

فہرست

حصہ دوم

ضروری ہدایت

شریعت کے جو مسائل نصِ قرآنی یا سُنّتِ نبوی پر مبنی ہیں اور انہیں تواترِ عملی کی حیثیت حاصل ہے وہ دائمی ہیں باقی مسائل ائمۂ دین اور فقہائے اِسلام کے اِجتہاد پر مبنی ہیں۔ ایسے اِجتہادی مسائل میں مقررہ ضابطہ کے تحت سلسلہ کے اہل الرّائے علماء کے مشورہ اور خلیفۂ وقت کی منظوری سے تبدیلی ہو سکتی ہے۔

والسلام خاکسار

مرزا طاہر احمد

خلیفۃ المسیح الرابع

10-2-83

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

پیش لفظ

—— ایڈیشن اوّل ——

قرآن کریم اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے یہ اس کی آخری اور کامل کتاب ہے اور اس میں ہماری ساری دینی، اخلاقی اور رُوحانی ضرورتوں کو اصولاً و اجمالاً پورا کیا گیا ہے قیامت تک بنی نوع انسان کو جو بھی مسائل درپیش ہوسکتے ہیں ان کا حل قرآن کریم میں موجود ہے۔

جس طرح قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لئے انسانوں کی مکمل ہدایت اور رہنمائی کی غرض سے نازل فرمایا ہے اسی طرح اس ہدایت کی تعلیم دینے، اس پر عمل پیرا ہونے اور اس کی حکمتیں بیان فرمانے کے لئے قیامت تک کے لئے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُسوۂ کامل بنا کر مبعوث فرمایا اور قرآن کریم کے معارف اور اس کی حکمتیں آپؐ کے قلبِ مطہرّ پر روشن فرمائیں چنانچہ خود قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق انسانی زندگی کو عمل کے جس سانچہ میں ڈھلنا چاہیئے اس کی اکمل اور احسن تصویر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار میں موجود ہے جس کی تقلید اُمّتِ محمدیہ کے لئے قیامت تک واجب قرار دے دی گئی ہے۔ اس مضمون کو بیان کرتے ہوئے قرآن کریم فرماتا ہے:-

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ [1]

تمہارے لئے یعنی ان لوگوں کے لئے جو اللہ اور اخروی دن سے ملنے کی امید رکھتے ہیں اور اللہ کا بہت ذکر کرتے ہیں اللہ کے رسول میں ایک اعلیٰ نمونہ ہے جس کی انہیں پیروی کرنی چاہیئے۔

پھر فرمایا:-

---

[1] سورۃ الاحزاب آیت ۲۲

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ [1]

تُو کہہ کہ اے لوگو اگر تم اللہ سے محبّت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو اس صورت میں وہ بھی تم سے محبّت کرے گا۔

ایک اور موقع پر فرمایا:۔

مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا [2]

رسول جو کچھ تم کو دے اس کو لے لو اور جس سے منع کرے اس سے رُک جاؤ۔

معاملاتِ شریعت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوہ کا ہی دوسرا نام "سُنّتِ رسول" ہے جو قرآن کریم پر عمل پیرا ہونے کا طریق متعین کرتی ہے۔ اصولِ فقہ میں اسے قرآن کریم کے بعد دوسری حیثیت حاصل ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی نمونہ کے بعد آپ کے ان ارشادات کا مقام ہے جو روایات کی شکل میں ہم تک پہنچے اور جنہیں حدیث کا اصطلاحی نام دیا گیا۔ یہ ارشادات تعلیمِ کتاب اور بیانِ حکمت کے مضمون سے تعلق رکھتے ہیں۔

اِس بارہ میں قرآن کریم میں آپ کی بعثت کے مقاصد بیان کرتے ہوئے آپ کے متعلق بتایا گیا:۔

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ [3]

اور انہیں کتاب اور حکمت سکھائے۔

پس یہ تعلیمِ کتاب اور بیانِ حکمت کا وہ پہلو ہے جو فرموداتِ نبویؐ سے تعلق رکھتا ہے اور فقہی اصطلاح میں اسے ہی حدیث کہا گیا ہے۔ خود قرآن کریم کی واضح ہدایت سے پتہ چلتا ہے کہ امورِ دینیہ میں جو قول بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو اس کی بنیاد لازماً وحیِ الٰہی میں موجود ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ [4]

اور وہ اپنی خواہشِ نفسانی سے کلام نہیں کرتا بلکہ وہ یعنی اس کا پیش کردہ کلام صرف خدا کی طرف سے نازل ہونے والی وحی ہے۔

یعنی آپ کا کوئی قول بھی نفسی خواہشات کے تابع نہیں بلکہ ہر بات وحیِ الٰہی پر مبنی ہے اِس حیثیت

---

[1] سورۃ آل عمران آیت ۳۲

[2] سورۃ الحشر آیت ۸

[3] سورۃ البقرہ آیت ۱۳۰

[4] سورۃ النجم آیت ۴، ۵

سے احادیث کا مقام سُنّتِ رسولؐ کے بعد اصولِ فقہ کی ترتیب میں تیسرے درجہ پر ہے۔

حدیث کو تیسرے درجہ پر رکھنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ جہاں سُنّت کو ہزاروں لاکھوں صحابہؓ، تابعین اور تبع تابعین کے نسلاً بعد نسلٍ تعامل و تواتر کی بناء پر غیر معمولی قطعیّت حاصل ہوئی ہے وہاں تمام احادیث کے ثبوت اور ان کی صحت کے بارے میں ایسی قطعیّت کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس میں بڑی حد تک تفحّص کی گنجائش موجود ہے۔

دُنیا میں حالات بدلتے رہتے ہیں اور نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں ان کے حل کے لئے بھی ہمیں قرآن کریم، سُنّتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور احادیث سے رہنمائی مل جاتی ہے بشرطیکہ تقویٰ اللہ سے معمور ایسے مطہّر وجود میسّر آجائیں جن پر قرآن کریم کے ارشاد لَا یَمَسُّہٗۤ اِلَّا الۡمُطَهَّرُوۡنَ ؕ[1] کے مطابق خدا تعالیٰ کی طرف سے قرآنی علوم کے معارف کھولے جائیں نیز وہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے کامل متبع ہوں کہ اُن کی فطرت سُنّتِ رسولؐ کے رنگ میں رنگین ہو چکی ہو۔

ہمارا یہ ایمان ہے کہ قرآن کریم کے اِس وعدہ کے مطابق کہ

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰـفِظُوۡنَ ۝[2]

اِس ذکر یعنی قرآن کریم کو ہم نے ہی اُتارا ہے اور ہم یقیناً اس کی حفاظت کریں گے۔

اللہ تعالیٰ خود اُمّتِ محمدیہ میں ایسے مطہّر وجود پیدا فرماتا رہتا ہے جو بدلتے ہوئے زمانہ کے تقاضوں کو قرآن وسُنّت کی روشنی میں پورا کرنے کے اہل ہوتے ہیں اور تعلیمِ قرآن کی حفاظت کا کام اُن کے سپرد کیا جاتا ہے۔ درحقیقت یہی لوگ ہیں جو مجتہد کہلانے کے مستحق ہیں جیسا کہ خلفائے راشدین اور دوسرے ائمہ دین خصوصاً امام ابوحنیفہؒ وغیرہ تھے۔ اس زمانہ میں خدا کی طرف سے مبعوث ہونے والے مبارک وجود حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حَکم و عدل ٹھہرایا ہے[3]۔ پس آپ نے قرآن و حدیث کی روشنی میں نئے پیدا شدہ فقہی مسائل کو حل کرنے اور استخراج احکام کے لئے اجتہاد سے کام لینے کا جو محفوظ طریق بتایا ہے جماعتِ احمدیہ اس پر کاربند اور عمل پیرا ہے۔ اس بارہ میں حضور علیہ السلام کے تفصیلی ارشادات "فقہ احمدیہ کے مأخذ" کے عنوان کے تحت الگ درج کئے جا رہے ہیں۔

---

[1] ترجمہ:- اس قرآن کی حقیقت کو وہی لوگ پاتے ہیں جو مطہّر ہوتے ہیں۔ سورۃ الواقعہ آیت ۸۰ ؛

[2] سورۃ الحجر آیت ۱۰ ؛ [3] بخاری کتاب الانبیاء باب نزول عیسیٰ بن مریم۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے فرمودات پر باحسن طور عمل پیرا ہونے کی غرض سے حضرت امام جماعتِ احمدیہ نے ایک مجلسِ افتاء قائم فرمائی ہوئی ہے جو نئے پیدا ہونے والے مسائل پر غور وفکر کرکے اپنی سفارشات حضرت امام جماعتِ احمدیہ کی خدمت میں پیش کرتی ہے اور آپ کی طرف سے منظوری کے بعد ان سفارشات پر مبنی "فیصلے" جماعت کے لئے واجب التعمیل ہوتے ہیں۔

کچھ عرصہ سے یہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ اُن لوگوں کی رہنمائی کے لئے جو کسی فقہی مسئلہ پر جماعتِ احمدیہ کا مسلک مستند طور پر جاننے کے خواہش مند ہوں مسائل فقہ کو مدوّن کر دیا جائے، چنانچہ ۱۹۷۶ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ نے جماعتِ احمدیہ کی مجلسِ شوریٰ میں پاس شدہ ریزولیوشن کے مطابق فقہ احمدیہ کی باقاعدہ تدوین کے لئے نو اراکین پر مشتمل ایک کمیٹی قائم فرمائی جس نے یہ مسوّدہ مرتب کیا۔

تدوین فقہ کمیٹی کے لئے مندرجہ ذیل اراکین مقرر ہوئے :-

۱ - حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز
۲ - خاکسار مرزا عبدالحق ایڈووکیٹ - صدر
۳ - محترم شیخ محمد احمد صاحب مظہر ایڈووکیٹ
۴ - " مجیب الرحمٰن صاحب ایڈووکیٹ
۵ - " مولانا ابوالعطاء صاحب فاضل (مرحوم)
۶ - " شیخ مبارک احمد صاحب فاضل
۷ - " میاں عبدالسمیع صاحب نون ایڈووکیٹ
۸ - " شیخ مظفر احمد صاحب ایڈووکیٹ
۹ - " ملک سیف الرحمٰن صاحب مفتی سلسلہ عالیہ - سیکرٹری

تدوین فقہ کا یہ کام مختلف مراحل میں سرانجام پایا۔ مسائل کو جمع کرکے اُن کی تحقیق و ترتیب اور بنیادی مسوّدے کی تیاری میں محترم ملک سیف الرحمٰن صاحب، حضرت مرزا طاہر احمد صاحب اور محترم مولانا ابوالعطاء صاحب مرحوم نے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔

اِس طرح ایک بنیادی مسوّدہ تیار ہونے کے بعد دوسرے مرحلے پر محترم مجیب الرحمٰن صاحب ایڈووکیٹ نے اس مسوّدہ کو دفعات کے پیرائے میں منتقل کیا اور مکرم مولوی محمد احمد صاحب ثاقب فاضل کے تعاون سے متن کی تشریح لکھی اور حوالہ جات تیار کئے۔ وراثت سے متعلقہ مسائل میں مکرم

پروفیسر عبد الرشید صاحب غنیؔ نے قابلِ قدر مواد مہیّا کیا۔

اِن جملہ حضرات نے خاکسار سے مسلسل رابطہ رکھا اور اِس طرح سے خاکسار کو اس کام کی نگرانی اور مناسب راہنمائی کا موقع ملا۔ مسوّدہ تیار ہو جانے کے بعد تدوین فقہ کمیٹی نے مندرجہ ذیل اصحاب کو مسوّدے پر تفصیلی غور و فکر کے لئے دعوت دی جنہوں نے اپنا قیمتی وقت صرف کر کے قابلِ قدر مشورے دیئے اور اس کی تفصیلی خواندگی میں حصّہ لیا:۔

مکرم مولوی محمد احمد صاحب جلیلؔ فاضل۔ مکرم چوہدری عزیز احمد صاحب ایڈووکیٹ ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج۔ مکرم چوہدری اے وحید سلیم صاحب ایڈووکیٹ۔ مکرم چوہدری ادریس نصر اللہ خاں صاحب ایڈووکیٹ۔ مکرم مرزا نصیر احمد صاحب ایڈووکیٹ۔ مکرم چوہدری اعجاز نصر اللہ خاں صاحب ایڈووکیٹ اور مکرم حمید اسلم صاحب ایڈووکیٹ۔

اِس تفصیل سے ظاہر ہے کہ فقہ احمدیہ کا یہ مسوّدہ جماعتِ احمدیہ کے مستند علماء اور قانون دان حضرات کی نظر سے گذرا ہے۔ تمام اصحاب جنہوں نے اِس کام کی تکمیل میں مدد دی ہے شکریے اور دُعا کے مستحق ہیں۔ فجزاھم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

مکرم سیّد شمس الحق صاحب فاضل اور مکرم چوہدری ہادی علی صاحب نے حوالہ جات کی تلاش و تحقیق میں عرق ریزی سے کام لیا۔ فجزاھما اللہ تعالیٰ۔

فقہ احمدیہ کا جو حصّہ اِس وقت پیش کیا جا رہا ہے وہ نکاح اور اس سے متعلقہ امور اور وراثت کے مسائل پر مبنی ہے۔ یہ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی منظوری کے بعد شائع کیا جا رہا ہے۔ جماعتِ احمدیہ اِس فقہ کی پابند ہے اور یہ فقہ مندرجہ امور پر جماعتِ احمدیہ کے فقہی مذہب کی مستند دستاویز ہے۔

اگر کسی مسئلے پر اِس مجموعے میں کوئی اصول یا راہنمائی نہ ملے تو اس مسئلہ میں فقہ حنفیہ پر عمل ہوگا سوائے اس کے کہ اس مجموعہ میں مندرجہ طریقِ کار کے مطابق بعد میں جماعتی اجتہاد کے ذریعے اس میں کوئی تبدیلی کی جائے۔

خاکسار

مرزا عبد الحق

صدر تدوین فقہ کمیٹی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم　　　نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہ الکریم

ایڈیشن دوم

"فقہ احمدیہ" کا پہلا ایڈیشن چند دنوں میں ہی ختم ہوگیا تھا فالحمد للہ۔ اِس لئے اب اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا جا رہا ہے۔ اِس میں صفحہ ۷۹ پر طلاق کے متعلق کسی قدر وضاحت کرنے کے لئے کچھ اضافہ کیا گیا ہے باقی سب حسبِ سابق ہے۔

پہلے ایڈیشن کے پیش لفظ میں مجلس مشاورت ۱۹۷۶ء کے اس ریزولیوشن کا ذکر رہ گیا تھا جس میں "فقہ احمدیہ" کی تدوین کا فیصلہ کیا گیا تھا اب اس مجلس مشاورت کی کارروائی کا متعلقہ حصہ بھی اخبار الفضل سے شاملِ اشاعت کیا جاتا ہے تاکہ اس فقہ کی تدوین کا پس منظر معلوم ہوسکے:۔

"۱۹۷۶ء کی مجلسِ مشاورت کی ایک خصوصیت تھی کہ اس میں فقہ احمدیہ کی تدوین و ترتیب کے متعلق تاریخی اہمیت کی حامل ایک اہم قرارداد بالاتفاق پاس کی گئی جس کے ذریعہ سیدنا حضرت امام جماعتِ احمدیہ ایدہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں یہ درخواست کی گئی کہ حضور ایک ایسی سب کمیٹی مقرر فرمائیں جو فقہ احمدیہ کو مدوّن و مرتّب کرے اور جو حضور کی منظوری سے کتابی صورت میں شائع ہو کر جماعت کے ہر فرد کیلئے قضائیہ معاملات اور ملکی عدالتوں میں پرسنل لاء کا کام دے سکے۔"

فقہ احمدیہ کی تدوین کے متعلق تاریخی قرارداد

۲۸ امان ہش ۱۳۵۵ کو مجلس مشاورت کے آخری اجلاس میں سیدنا حضرت امام جماعتِ احمدیہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے محترم جناب شیخ محمد احمد صاحب مظہر ایڈووکیٹ نے "فقہ احمدیہ" کی تدوین کے سلسلہ میں تاریخی اہمیت کی حامل ایک اہم قرارداد پیش فرمائی جس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"فقہی معاملات کے بارے میں حضرت بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ کا ارشاد حسب ذیل ہے:۔

"اگر حدیث میں کوئی مسئلہ نہ ملے اور نہ سنّت میں اور نہ قرآن میں مل سکے تو اس صورت

یں فقہ حنفی پر عمل کریں کیونکہ اس فرقہ کی کثرت خدا کے ارادہ پر دلالت کرتی ہے اور اگر بعض موجودہ تغیّرات کی وجہ سے فقہ حنفی کوئی صحیح فتویٰ نہ دے سکے تو اس صورت میں علماء اس سلسلہ کے اپنے خداداد اجتہاد سے کام لیں، لیکن ہوشیار رہیں کہ مولوی عبداللہ چکڑالوی کی طرح بے وجہ احادیث سے انکار نہ کریں ہاں جہاں قرآن اور سُنّت سے کسی حدیث کو معارض پاویں تو اس حدیث کو چھوڑ دیں۔"

(ریویو بر مباحثہ چکڑالوی و بٹالوی صفحہ ۶ سن تصنیف نومبر ۱۹۰۲ء، رُوحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۲۱۲)

خدا تعالیٰ کے فضل سے جماعتِ احمدیہ مندرجہ بالا تعلیم کی پابند رہی ہے اور رہے لیکن ابھی تک فقہ احمدیہ پُورے طور پر مدوّن شکل میں جماعت کے سامنے نہیں آئی اِس لئے :

"مجلسِ شوریٰ جو تمام جماعتہائے احمدیہ کی نمائندہ مجلس ہے حضرت امام جماعت ایدہ اللہ تعالےٰ بنصرہ العزیز کی خدمت میں مؤدبانہ درخواست کرتی ہے کہ حضور ایک سب کمیٹی مقرر فرمائیں جو فقہ احمدیہ کو مدوّن اور مرتّب کرے اور یہ فقہ مسائلِ وراثت، ہبہ، نکاح، زکوٰۃ، گارڈین شپ اور دیگر ضروری فقہی امور پر مشتمل ہو جسے حضور ایدہ اللہ تعالیٰ کی منظوری کے بعد فقہ احمدیہ ..... یا مختصراً فقہ احمدیہ کے نام سے شائع کیا جائے تاکہ یہ فقہ جماعتِ احمدیہ کے ہر فرد کے لئے قضائیہ معاملات اور مُلکی عدالتوں میں پرسنل لاء کا کام دے۔"

مختلف نمائندگان نے اپنی آراء کا اِظہار کرتے ہوئے اِس قرارداد کا پُر جوش خیر مقدم کیا اور جب اسے رائے شماری کے لئے پیش کیا گیا تو جملہ نمائندگان نے متفقہ طور پر اس کی تائید کی۔ یہ امر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ حضرت امام جماعتِ احمدیہ نے بھی نمائندگان کے ہمراہ کھڑے ہو کر اس کے حق میں اپنی رائے کا اظہار فرمایا۔

اِس متفقہ سفارش کو حضور نے منظور فرمالیا۔" (منقول از روزنامہ الفضل ۲۹۔ مارچ ۱۹۷۶ء)

اِس فیصلہ کے پیشِ نظر حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ نے جو کمیٹی تشکیل فرمائی تھی اس کا ذکر ایڈیشن اوّل کے پیش لفظ میں موجود ہے۔

خاکسار

مرزا عبدالحق ایڈووکیٹ

صدر تدوین فقہ کمیٹی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فقہ احمدیہ کے مأخذ

تمہید

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کی گئی آخری اور کامل شریعت ہے اور تمام اسلامی قوانین واحکام کا حقیقی، اصل اور بنیادی منبع ہے۔

چونکہ قرآن کریم میں کئی احکام اصولی اور اجمالی طور پر بیان ہوئے ہیں اس لئے بسا اوقات احکامِ قرآنی کی تفصیل کے لئے سُنّت کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے اور انہی بناء پر اجتہاد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اجتہاد کے معنے یہ ہیں کہ بدلے ہوئے حالات کے تقاضا کے پیشِ نظر قرآن اور سُنّت میں بیان کردہ اصول کی روشنی سے استفادہ یا شرعی امثال پر قیاس کر کے حسبِ ضرورت نئے احکام اخذ کئے جائیں۔ غرض نئی ضرورتوں کے لئے مختلف مسلّمہ ذرائع کی مدد سے نئے احکام اخذ کرنا اِجتہاد کہلاتا ہے جس کے مختلف طریقے ہوسکتے ہیں۔

اسی فکر و تدبّر اور شعوری کوشش کو اور اس کے نتیجہ میں مرتب شدہ احکامِ شریعت کو علمِ فِقہ کہا جاتا ہے۔

تمام فقہی مسائل کے لئے قرآن، سُنّت اور حدیث بنیادی مأخذ ہیں۔ قیاس، استحسان، استدلال، استصحابُ الحال اور عرف وغیرہ قرآن اور حدیث کے تابع اور مسائل فقہ کے ضمنی مأخذ ہیں۔ مذاہب فقہ حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی یا اثنا عشری میں اختلاف ان بنیادی یا ضمنی مأخذ سے احکام کے استخراج و استنباط اور اجتہاد کے طریقِ کار میں اختلاف کی وجہ سے ہوا ہے۔

جماعتِ احمدیہ صدقِ دل سے قرآن شریف کو آخری اور کامل شریعت مانتی ہے اسی طرح وہ سُنّت و حدیث کے حجّتِ شرعی ہونے کی بھی قائل ہے۔ پس فقہ احمدیہ کے بنیادی مأخذ اور مصادر قرآن، سُنّت اور حدیث ہیں اور ثانوی مأخذ قیاس، اِستحسان وغیرہ ان بنیادی مصادر کے باہمی تعلق کی بابت

جماعتِ احمدیہ اِس عقیدے پر قائم ہے کہ قرآن شریف کی کوئی آیت منسوخ نہیں لہٰذا فقہاء کے نزدیک جو چیز نسخ قرآن بالقرآن یا نسخ قرآن بالسنہ کہلاتی ہے جماعتِ احمدیہ کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ جماعتِ احمدیہ نسخ قرآن کی قائل ہی نہیں۔ اگر کسی جگہ حدیث قرآن سے مختلف نظر آئے تو اس اختلاف کو دُور کرنے اور ان دونوں میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش ہونی چاہیئے اور اگر کسی طرح سے بھی تطبیق نہ ہو سکے تو حدیث کو ترک کر دینے میں ہی برکت ہے کیونکہ قرآن کا فیصلہ اٹل ہے۔

فِقہ احمدیہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں سُنّت اور حدیث کو ایک چیز نہیں مانا گیا کیونکہ جماعتِ احمدیہ کے نزدیک سُنّت عملی تواتر کا نام ہے اور حدیث روایات کا مجموعہ ہے جنہیں بہت بعد میں مدوّن کیا گیا تھا۔

جماعتِ احمدیہ کے بانی حضرت مسیح موعود و مہدی معہود علیہ الصّلوٰۃ والسلام فقہ کے مأخذ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"میرا مذہب یہ ہے کہ تین چیزیں ہیں کہ جو تمہاری ہدایت کے لئے خدا نے تمہیں دی ہیں۔ سب سے اوّل قرآن ہے جس میں خدا کی توحید اور جلال اور عظمت کا ذکر ہے ....سو تم ہوشیار رہو اور خدا کی تعلیم اور قرآن کی ہدایت کے برخلاف ایک قدم بھی نہ اُٹھاؤ۔ میں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ جو شخص قرآن کے سات سَو حکم میں سے ایک چھوٹے سے حکم کو بھی ٹالتا ہے وہ نجات کا دروازہ اپنے ہاتھ سے اپنے پر بند کرتا ہے۔" [1]

نیز فرماتے ہیں:۔

"قرآن شریف جو کتاب اللہ ہے جس سے بڑھ کر ہمارے ہاتھ میں کوئی کلام قطعی اور یقینی نہیں وہ خدا کا کلام ہے وہ شک اور ظنّ کی آلائشوں سے پاک ہے۔" [2]

"دوسرا ذریعہ ہدایت کا جو مسلمانوں کو دیا گیا ہے سُنّت ہے ....مسلمانوں پر قرآن شریف کے بعد بڑا احسان سُنّت کا ہے۔ خدا اور رسولؐ کی ذمّہ داری کا فرض صرف دو امر تھے اور وہ یہ کہ خدا تعالیٰ قرآن کو نازل کر کے مخلوقات کو بذریعہ اپنے قول کے اپنے منشاء سے اطلاع دے۔ یہ تو خدا کے قانون کا فرض تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] کشتی نوح ص۲۴ سنِ تصنیف ۵ راکتوبر ۱۹۰۲ء، روحانی خزائن جلد ۱۹ ص۲۶

[2] ریویو برمباحثہ چکڑالوی وبٹالوی ص۳ سنِ تصنیف نومبر ۱۹۰۲ء، روحانی خزائن جلد ۱۹ ص۲۰۹

کا یہ فرض تھا کہ خدا کے کلام کو عملی طور پر دکھلا کر بخوبی لوگوں کو سمجھا دیں"۔ [۱]

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن شریف کی اشاعت کے لئے مامور تھے۔ ایسا ہی سُنّت کی اقامت کے لئے بھی مامور تھے۔ پس جیسا کہ قرآن شریف یقینی ہے ایسا ہی سُنّتِ معمولہ متواترہ بھی یقینی ہے۔ یہ دونوں خدمات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھ سے بجالائے"۔ [۲]

"سُنّت سے مراد ہماری صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فعلی روش ہے جو اپنے اندر تواتر رکھتی ہے اور ابتداء سے قرآن شریف کے ساتھ ظاہر ہوئی اور ہمیشہ ساتھ ہی رہے گی یا بہ تبدیل الفاظ یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن شریف خدا کا قول ہے اور سُنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل اور قدیم سے عادت اللہ یہی ہے کہ انبیاء علیہم السلام خدا کا قول لوگوں کی ہدایت کے لئے لاتے ہیں تو اپنے عملی فعل سے یعنی عملی طور پر اس قول کی تفسیر کر دیتے ہیں تا اس قول کا سمجھنا لوگوں پر مشتبہ نہ رہے اور اس قول پر آپ بھی عمل کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی عمل کراتے ہیں"۔ [۳]

"تیسرا ذریعہ ہدایت کا حدیث ہے کیونکہ بہت سے اِسلام کے تاریخی اور اخلاقی اور فقہ کے امور کو حدیثیں کھول کر بیان کرتی ہیں اور نیز بڑا فائدہ حدیث کا یہ ہے کہ وہ قرآن کی خادم اور سُنّت کی خادم ہے"۔ [۴]

"سُنّت اور حدیث میں ما بہ الامتیاز یہ ہے کہ سُنّت ایک عملی طریق ہے جو اپنے ساتھ تواتر رکھتا ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے جاری کیا اور وہ یقینی مراتب میں قرآن شریف سے دوسرے درجہ پر ہے اور جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن شریف کی اشاعت کے لئے مامور تھے ایسا ہی سُنّت کی اقامت کے لئے بھی مامور تھے۔ پس جیسا کہ قرآن شریف یقینی ہے ایسا ہی سُنّتِ معمولہ متواترہ بھی یقینی ہے۔ یہ دونوں خدمات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھ سے بجالائے اور دونوں کو اپنا فرض سمجھا۔

---

[۱] کشتی نوح صفحہ ۵۷ سنِ تصنیف ۱۹۰۲ء، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۶۱

[۲] ریویو بر مباحثہ چکڑالوی و بٹالوی صفحہ ۴ سنِ تصنیف نومبر ۱۹۰۲ء، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۲۱۰

[۳] " " " " " " " " صفحہ ۲۰۹

[۴] کشتی نوح صفحہ ۵۷ سنِ تصنیف ۱۹۰۲ء، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۶۱

مثلاً جب نماز کے لئے حکم ہُوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا تعالیٰ کے اس قول کو اپنے فعل سے کھول کر دکھلا دیا اور عملی رنگ میں ظاہر کر دیا کہ فجر کی یہ رکعات ہیں اور مغرب کی یہ۔ اور باقی نمازوں کے لئے یہ یہ رکعات ہیں۔ ایسا ہی حج کر کے دکھلایا اور پھر اپنے ہاتھ سے ہزارہا صحابہ کو اس فعل کا پابند کر کے سلسلہ تعامل بڑے زور سے قائم کر دیا۔ پس عملی نمونہ جو اب تک اُمت میں تعامل کے رنگ میں مشہود و محسوس ہے۔ اِسی کا نام سُنّت ہے۔

لیکن حدیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رُوبرو نہیں لکھوایا اور نہ اس کے جمع کرنے کے لئے کوئی اہتمام کیا..... پھر جب وہ دَورِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا گذر گیا تو بعض تابعین کی طبیعت کو خدا نے اس طرف پھیر دیا کہ حدیثوں کو بھی جمع کر لینا چاہیئے تب حدیثیں جمع ہوئیں۔

اِس میں شک نہیں کہ اکثر حدیثوں کے جمع کرنے والے بڑے متقی اور پرہیزگار تھے انہوں نے جہاں تک ان کی طاقت میں تھا حدیثوں کی تنقید کی اور ایسی حدیثوں سے بچنا چاہا جو اُن کی رائے میں موضوعات میں سے تھیں اور ہر ایک مشتبہ الحال راوی کی حدیث نہیں لی۔ بہت محنت کی مگر تاہم چونکہ وہ ساری کارروائی بعد از وقت تھی اِس لئے وہ سب ظن کے مرتبہ پر رہی بایں ہمہ یہ سخت ناانصافی ہوگی کہ یہ کہا جائے کہ وہ سب حدیثیں لغو اور نکمّی اور بے فائدہ اور جھوٹی ہیں بلکہ ان حدیثوں کے لکھنے میں اِس قدر احتیاط سے کام لیا گیا ہے اور اس قدر تحقیق اور تنقید کی گئی ہے جو اس کی نظیر دوسرے مذاہب میں نہیں پائی جاتی..... تاہم یہ غلطی ہے کہ ایسا خیال کیا جائے کہ جب تک حدیثیں جمع نہیں ہوئی تھیں اس وقت تک لوگ نمازوں کی رکعات سے بے خبر تھے یا حج کرنے کے طریق سے ناآشنا تھے کیونکہ سلسلہ تعامل نے جو سُنّت کے ذریعہ سے ان میں پیدا ہو گیا تھا تمام حدود اور فرائضِ اسلام ان کو سکھلا دیئے تھے اِس لئے یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ان حدیثوں کا دُنیا میں اگر وجود بھی نہ ہوتا جو مدّتِ دراز کے بعد جمع کی گئیں تو اِسلام کی اصل تعلیم کا کچھ بھی حرج نہ تھا کیونکہ قرآن اور سلسلہ تعامل نے ان ضرورتوں کو پُورا کر دیا تھا تاہم حدیثوں نے اس نور کو زیادہ کیا گویا اسلام نُوْرٌ عَلٰی نُوْر ہو گیا اور حدیثیں قرآن اور سُنّت کے لئے گواہ کی طرح کھڑی ہو گئیں اور اسلام

کے بہت سے فرقے جو بعد میں پیدا ہو گئے ان میں سے سچے فرقہ کو احادیثِ صحیحہ سے بہت فائدہ پہنچا۔" [1]

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام مزید فرماتے ہیں :۔

"ہماری جماعت کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ اگر کوئی حدیث معارض اور مخالفِ قرآن اور سُنّت نہ ہو تو خواہ کیسے ہی ادنیٰ درجہ کی حدیث ہو اس پر وہ عمل کریں اور انسان کی بنائی ہوئی فقہ پر اس کو ترجیح دیں۔" [2]

اِن تین رہنما محکم اصولوں کے بعد جن پر تمام شریعتِ حقہ کی بنیاد ہے اگر کوئی مسئلہ حل طلب رہ جائے یا اس کے حل میں مزید روشنی اور راہنمائی کی ضرورت ہو یا کوئی نیا مسئلہ پیدا ہو جائے تو ان مسائل کے حل کے لئے جماعت کے مجتہدین اور راسخین فی العلم کو حضرت بانئ سلسلہ عالیہ احمدیہ کی حسبِ ذیل ہدایت ہے :۔

"اگر حدیث میں کوئی مسئلہ نہ ملے اور نہ سُنّت میں اور نہ قرآن میں مل سکے تو اس صورت میں فقہ حنفی پر عمل کر لیں کیونکہ اس فرقہ کی کثرت خدا کے ارادہ پر دلالت کرتی ہے اور اگر بعض موجودہ تغیّرات کی وجہ سے فقہ حنفی کوئی صحیح فتویٰ نہ دے سکے تو اس صورت میں علماء اس سلسلہ کے اپنے خداداد اجتہاد سے کام لیں لیکن ہوشیار رہیں کہ مولوی عبداللہ چکڑالوی کی طرح بے وجہ احادیث سے انکار نہ کریں۔ ہاں جہاں قرآن اور سُنّت سے کسی حدیث کو معارض پاویں تو اس حدیث کو چھوڑ دیں۔" [3]

حضور علیہ السلام حضرت امام ابوحنیفہؒ کے بارہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں :۔

"وہ ایک بحرِ اعظم تھا اور دوسرے سب اس کی شاخیں ہیں۔ اس کا نام اہل الرائے رکھنا ایک بھاری خیانت ہے۔ امام بزرگ ابوحنیفہؒ کو علاوہ کمالات علم آثار نبویہ کے استخراج

---

[1] ریویو بر مباحثہ چکڑالوی و بٹالوی صفحہ ۵ سن تصنیف نومبر ۱۹۰۲ء روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۲۰۹ تا صفحہ ۲۱۱

[2] " " " " " صفحہ ۶ " " " " صفحہ ۲۱۲

[3] " " " " " " " " " " " "

مسائلِ قرآن میں یدِ طولیٰ تھا۔ خدا تعالیٰ حضرت مجدّد الف ثانیؒ پر رحمت کرے انہوں نے مکتوب ۵۵ میں فرمایا ہے کہ امام اعظم صاحب کی آنے والے مسیح کے ساتھ استخراج مسائل قرآن میں ایک رُوحانی مناسبت ہے۔" [1]

حضور علیہ السلام ازالہ اوہام میں فرماتے ہیں :-

"اصل حقیقت یہ ہے کہ امام صاحب موصوف اپنی قوّتِ اجتہادی اور اپنے علم اور درایت اور فہم و فراست میں ائمہ ثلاثہ باقیہ سے افضل و اعلیٰ تھے اور ان کی خداداد قوّتِ فیصلہ ایسی بڑھی ہوئی تھی کہ وہ ثبوت عدمِ ثبوت میں بخوبی فرق کرنا جانتے تھے اور ان کی قوّتِ مدرکہ کو قرآن شریف کے سمجھنے میں ایک خاص دستگاہ تھی اور ان کی فطرت کو کلامِ الٰہی سے ایک خاص مناسبت تھی اور عرفان کے اعلیٰ درجہ تک پہنچ چکے تھے اور اسی وجہ سے اجتہاد و استنباط میں ان کے لئے وہ درجہ علیا مسلّم تھا جس تک پہنچنے سے دوسرے سب لوگ قاصر تھے۔" [2]

---

[1] الف :- الحق مباحثہ لدھیانہ سنِ تصنیف ۱۸۹۱ء صـ۱۵۱، روحانی خزائن جلد ۴ صـ۱۰۱

ب :- نیز علامہ محمد نجم الغنی خان صاحب رام پوری اپنی کتاب "مذاہب اسلام" صـ۳۴ پر لکھتے ہیں درِ مختار میں امام ابوحنیفہؒ کے جہاں اور اوصاف لکھے ہیں ان میں یہ بھی لکھا ہے یحکم بمذھبہ عیسٰی علیہ السلام یعنی امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے موافق عیسٰی علیہ السلام حکم کریں گے اور محشی چلپی نے اس کا مطلب یوں بیان کیا ہے کہ حضرت مسیحؑ اجتہاد کریں گے اور ان کا اجتہاد امام ابوحنیفہؒ کے اجتہاد کے موافق پڑے گا۔

[2] ازالہ اوہام سنِ تصنیف ۱۸۹۱ء صفحہ ۵۳۰، ۵۳۱، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۳۸۵

اِستدراک

فِقہ احمدیہ میں عام مدوّن فِقہ حنفی سے بعض امور میں اِختلاف کیا گیا ہے۔ یہ اِختلاف فقہ حنفی کے اصولوں سے باہر نہیں۔ پس جس طرح حضرت امام ابوحنیفہؒ سے آپ کے بعض شاگردوں مثلاً حضرت امام ابویوسفؒ یا حضرت امام محمدؒ کا اِختلاف فِقہ حنفی کے دائرہ سے ان کو باہر نہیں لے جاتا اور ان کے اِس اختلاف کو فقہ حنفی کی مخالفت نہیں سمجھا جاتا اسی طرح فِقہ احمدیہ کا بعض امور میں اختلاف فِقہ حنفی کے مخالف قرار نہیں دیا جا سکتا خصوصاً جبکہ یہ اختلاف انہی اصولوں پر مبنی ہے جنہیں فقہاء حنفی تسلیم کرتے ہیں کیونکہ فِقہ احمدیہ کے وہی مأخذ ہیں جو فِقہ حنفی کے ہیں۔

○

تعریفِ نکاح

دفعہ نمبر ۱

نکاح مَرد اور عورت کے درمیان شارع کی عائد کردہ شرائط کے مطابق ایک شرعی معاہدہ ہے جو جنسی جبلّت کو حدود اللہ کا پابند کرکے فریقین کے درمیان جنسی تعلق کو جائز اور اولاد کے نسب کو صحیح ٹھہراتا ہے۔

تشریح شریعت کی اصطلاح میں نکاح ایک معاہدہ ہے جس کا مقصد جائز اولاد پیدا کرنا ہے۔[1]
چونکہ اسلام دینِ فطرت ہے اِس لئے اس نے طبعی حوائج اور جبلّی ضروریات کو کُلیّةً نظر انداز کرنے یا دبانے کی اجازت نہیں دی اور تجرّد اور جنسی تعلقات سے اِجتناب کی زندگی کو سخت ناپسند فرمایا ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "اِنَّ الرَّهْبَانِيَّةَ لَمْ تُكْتَبْ عَلَيْنَا"۔[2]
یعنی رہبانیۃ اور ترکِ دنیا کا ہمیں حکم نہیں دیا گیا۔

ایک اور مشہور عوام حدیث ہے :-

---

[1] فقہاء نے نکاح کی اِصطلاحی تعریف یہ کی ہے :-
اَلنِّكَاحُ فِي الشَّرْعِ عَقْدٌ مَدَنِيٌّ لَفْظِيٌّ اَوْ خَطِّيٌّ بَيْنَ رَجُلٍ وَّ امْرَاةٍ بَالِغَيْنِ رَاشِدَيْنِ يَحْفَظَانِ بِهٖ عَلَيْهِمَا عِفَافَهُمَا وَصَلَاحَهُمَا ثُمَّ يَنْشَأَنِ مِنْهُ اُسْرَةً۔ (الاسرۃُ فی الشرع الاسلامی ص۸ مرتّبہ عمر فروخ بیروت لبنان)
یعنی نکاح ایک تمدّنی معاہدہ ہے جو عاقل بالغ مرد اور عاقلہ بالغہ عورت آپس میں زبانی یا تحریری طور پر کرتے ہیں اور اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کے ذریعہ اپنی عفت کی حفاظت کریں اور بھلائی کا سامان کرکے ایک گھر آباد کریں تاکہ اس سے کُنبہ کی بُنیاد پڑے۔

[2] مسند احمد بن حنبل جلد ۶ ص۲۲۶

لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ[1] کہ اسلام میں مجرّد رہنے اور دُنیا ترک کر دینے کی کوئی ہدایت نہیں اور نہ ہی اس کے پسندیدہ ہونے کی کوئی سند ہے۔

اسی طرح حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ صحابہؓ نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ نمازیں پڑھیں گے، روزے رکھیں گے اور عمر بھر شادی نہیں کریں گے۔ یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپؐ نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:۔

"کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ مَیں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ روزے بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں اور مَیں نے شادیاں بھی کی ہیں"

اسی سلسلہ میں آپؐ نے فرمایا:۔

"نکاح میری سُنّت ہے اور جو شخص میری سُنّت کو ترک کرتا ہے میرا اُس سے کوئی تعلق نہیں"

اس حدیث کے ایک حصّہ کے الفاظ یہ ہیں:۔

ا۔ "اَتَزَوَّجُ النِّسَآءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ"[2]

ب۔ "اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ فَمَنْ لَمْ يَعْمَلْ بِسُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ"[3]

آپؐ نے یہ بھی فرمایا:۔

"مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَاِنَّهٗ اَغَضُّ لِلْبَصَرِ"[4]

یعنی تم میں سے جو شادی کی توفیق رکھتا ہے اسے چاہیئے کہ شادی کرے کیونکہ شادی نظر نیچی رکھنے اور پاکدامن رہنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اِس ارشاد میں فَلْيَتَزَوَّجْ کا لفظ استعمال فرمایا جو امر کا صیغہ ہے

---

[1] لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ۔ المبسوط سرخسی ص۱۱۱۔ یہ الفاظ حدیث کی کسی کتاب میں نہیں ملتے البتہ ابوداؤد میں "لَا صَرُوْرَةَ فِي الْاِسْلَامِ" کے الفاظ مروی ہیں۔ صیرورة کے معنے ہیں انقطع عن النکاح وتبتّل۔ ابوداؤد کتاب المناسک باب لاصیرورة نیز دیکھیں مکتوباتِ سلیمانی جلد ۱ ص۲۱۵۔

[2] بخاری کتاب النکاح باب ترغیب النکاح جلد ۲ ص۷۵۷

[3] ابنِ ماجہ کتاب النکاح باب فضل النکاح ص۱۳۲

[4] ابوداؤد کتاب النکاح باب التحریض علی النکاح جلد اوّل ص۲۷۹

اور اصولاً وجوب پر دلالت کرتا ہے۔

اِسی طرح قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ؕ ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝ [1]

یعنی اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ تم بیوہ عورتوں سے انصاف نہ کر سکو گے تو جو صورت تمہیں پسند ہو کر لو یعنی حسبِ پسند دو دو سے اور تین تین سے اور چار چار سے نکاح کر لو لیکن اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ تم عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی عورت سے یا اُن لونڈیوں سے جو تمہارے ہاتھوں میں ہیں نکاح کرو۔ یہ طریق اُس بات کے بہت قریب ہے کہ تم ظلم و تعدّی سے بچ جاؤ۔

اِس ارشادِ ربّانی میں "فَانْکِحُوْا" کے صیغہ سے صاف ظاہر ہے کہ صاحبِ استطاعت کیلئے نکاح واجب ہے۔

○

مقاصدِ نکاح

دفعہ نمبر ۲

نکاح کا مقصد بقاءِ نسلِ انسانی، تحفّظِ عفت، حصولِ مودّت اور سکینت پر مبنی پُرامن عائلی زندگی کی ضمانت مہیّا کرنا ہے۔

تشریح قرآن کریم میں شادی شدہ مرد اور عورت کو محصن اور محصنہ کہا گیا ہے[2] جس کے معنے قلعہ بند

---

[1] سورۃ النساء آیت ۴

[2] سورۃ النساء آیت ۲۵

ہو جانے کے ہیں۔ اِس میں اِس طرف اشارہ ہے کہ شادی کا مقصد مرد اور عورت کو شیطانی وساوس اور شہوانی حملوں سے محفوظ رکھنا ہے گویا تحفظ عفت اور تقویٰ شعار زندگی نکاح کے اہم مقاصد میں شامل ہے۔

اِسی طرح نکاح کے ذریعہ سے نسلِ اِنسانی کی بقاء نسب کا تحفّظ اور عائلی زندگی کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنا بھی مقصود ہے۔

○

اہلیّتِ نکاح

دفعہ نمبر ۳

ہر عاقل، بالغ احمدی نکاح کرنے کا اہل ہے

تشریح چونکہ نکاح کے نتیجہ میں فریقین پر ایسے حقوق و فرائض عائد ہوتے ہیں جس کے فریقین شرعًا اور قانونًا پابند ہوتے ہیں اِس لئے اس معاہدہ کے دو بنیادی اوصاف یعنی عقل اور بلوغت کا پایا جانا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجنون، فاتر العقل اور نابالغ خود اپنا نکاح کرنے کے اہل نہیں ہیں ہاں ان کی طرف سے ان کے ولی یہ معاہدہ کر سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں فاتر العقل یا نابالغ کا ولی بوجہ نیابتِ منکوحہ کے نان ونفقہ اور مہر کا ذمّہ دار ہوگا۔[1]

○

[1] سوال:۔ اگر نابالغ لڑکے یا لڑکی کا نکاح اس کا ولی کر دے اور ہنوز وہ نابالغ ہی ہو اور ایسی ضرورت پیش آوے تو کیا طلاق بھی ولی دے سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:۔ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا "کہ دے سکتا ہے"

(بدر ۲۵ جولائی ۱۹۰۷ء بحوالہ فتاوٰی مسیح موعود صفحہ ۱۴۶)

بلوغت

دفعہ نمبر ۴

نکاح کی اغراض کے لئے مَرد اور عورت کی بلوغتِ طبعی کافی اور مُعتبر ہے تاہم ملکی حالات اور علاقہ کی آب وہَوا کو ملحوظ رکھتے ہوئے مَرد اور عورت کی بلوغت کی اَوسط عمر متعین کرنے کے لئے مناسب قانون بنایا جا سکتا ہے ۔

تشریح اغراضِ نکاح کے لئے شرعًا لڑکا یا لڑکی اُس وقت بالغ سمجھے جائیں گے جب وہ جسمانی نشوونما کے اعتبار سے بالغ ہو جائیں گے جس کی ایک طبعی علامت لڑکے کے لئے اِحتلام اور لڑکی کے لئے حیض کا شروع ہونا ہے۔

بلوغت کی یہ عمر خاندانی حالات ، خوراک، صحت اور ملکی آب وہَوا کے اعتبار سے مختلف ہو سکتی ہے۔

اگر یکسانی کی غرض سے قانون کا تقاضا ہو تو مختلف اغراض کے لئے بلوغت کی عمر سالوں میں بھی معیّن کی جا سکتی ہے۔ مثلاً شادی کی اغراض کے لئے لڑکے کی عمر ۱۸ سال اور لڑکی کی عمر ۱۶ سال مقرر کی جا سکتی ہے ۔ اِسی طرح مالی تصرّف کے لئے لڑکے لڑکی کی عمر اٹھارہ سال تجویز کی جا سکتی ہے اور اس میں کوئی شرعی روک نہیں۔

○

رَضا

دفعہ نمبر ۵

عاقل بالغ مَرد اپنے نکاح کے لئے خود رضامندی دے گا البتہ عاقل بالغ عورت کی اپنی رضامندی کے علاوہ اس کے ولی کی رضامندی بھی ضروری ہے۔

تشریح چونکہ نکاح سے متعلق جُملہ حقوق و فرائض براہِ راست مَرد سے وابستہ ہیں جیسے حق مہر کی ادائیگی، بیوی اور بچّوں کے نان و نفقہ کی ذمہ داری اور ان حقوق و فرائض کی ادائیگی کسی وکیل یا ولی کے ذمہ واجب نہیں ہوتی اِس لئے صحتِ نکاح کے لئے عاقل بالغ مرد کی اپنی رضامندی ہی کافی اور معتبر ہے۔

البتہ اگر مَرد نا بالغ یا مجنون ہو تو اس کے ولی کی رضامندی ضروری ہوگی اور وہ بھی ان مالی حقوق کی ادائیگی کا ذمّہ دار ہوگا جو نکاح کے نتیجہ میں خاوند کے ذمّہ عائد ہوتے ہیں۔

عورت کی اپنی رضامندی کے ساتھ اس کے ولی کی رضامندی بھی ضروری ہے۔ اِس بارہ میں مفصّل بحث زیرِ دفعہ ۸ تشریح شرط ۲ صفحہ ۳۹ دیکھیں۔

کفائت

دفعہ نمبر ۶

نکاح میں مَرد کا عورت کے لئے کفو ہونا مستحسن ہے

تشریح کفو کے لفظی معنے ہم پلّہ اور برابر ہونے کے ہیں۔ فقہاء نے بعض دائروں میں کفو یعنی

مرد کا اس کے ہم پلّہ ہونے کی معاشرتی اہمیّت کو تسلیم کیا ہے کیونکہ کفائت کا اصل مقصد فریقین کی ازدواجی زندگی میں ہم آہنگی اور موافقت پیدا کرنا ہے۔

کفو میں مذہب، دینداری اور معاشرتی یکسانی کو بنیادی حیثیّت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ نسب، پیشہ، تعلیم اور عمر و صحت کو بھی مدِّ نظر رکھ لیا جائے تو اس میں برکت اور معاشرتی بہتری ہے۔ تاہم اگر مَرد اور عورت اور اس کا ولی اس دوسرے درجہ کے تفاوت کو علم کے باوجود نظر انداز کر دیں تو شرعاً نکاح مکمل ہو گا اور اس تفاوت کی وجہ سے اس نکاح کے فسخ کئے جانے کے مطالبہ کا کوئی جواز نہ ہوگا۔

بہرحال اِن سب امور میں سے دینی کفائت اور مساوات کو بنیادی اہمیّت حاصل ہے۔ اِسی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

"تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ لِمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا وَلِجَمَالِهَا وَلِدِيْنِهَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ تَرِبَتْ يَدَاكَ" [1]

یعنی اہلی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے کسی عورت سے شادی کرنے کے سلسلہ میں جن باتوں کو مدِّ نظر رکھا جاتا ہے ان میں مندرجہ ذیل چار امور کو زیادہ اہمیّت حاصل ہوتی ہے۔ اوّل عورت کے خاندان کی مالی حالت، دوئم عورت کی خاندانی وجاہت، سوئم عورت کا حُسن وجمال اور چہارم عورت کی دینداری اور اس کی حُسنِ سیرت۔ تاہم ایک مومن کو چاہیئے کہ وہ حُسنِ سیرت اور دینداری کے پہلو کو ترجیح دے۔

ایسی ہی تمدّنی، معاشرتی اور تربیتی وجوہات کی بناء پر پیدا ہونے والے مسائل اور اُلجھنوں کے پیشِ نظر جماعتِ احمدیہ ایک احمدی عورت کو اِس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ کسی غیر احمدی مَرد سے شادی کرے۔ ایسی شادی کفائت کے دینداری والے معیار پر پُوری نہیں اُترتی تاہم اگر نظامِ جماعت کی خلاف ورزی میں ایسی شادی ہو جائے تو اسے باطل قرار نہیں دیا جائے گا یعنی ایسے نکاح کے بعد پیدا ہونے والی اولاد ثابت النسب ہوگی اسے سارے شرعی اور قانونی حقوق حاصل ہوں گے اور وہ وراثت کی حقدار ہوگی۔ [2]

○

---

[1] بخاری کتاب النکاح باب الاکفاء فی الدین جلد ۲ صـ۷۶۲

[2] مزید تفصیل کے لئے دیکھیں دفعہ نمبر ۱۴، ۱۷ نکاح فاسد اور ثبوت النسب۔

اِنعقادِ نکاح

دفعہ نمبر ۷

نکاح فریقین کے ایجاب وقبول اور معروف طریقہ پر اس کے اظہار سے منعقد ہوتا ہے۔ یہ ایجاب وقبول ایک ہی مجلس میں ہو اور اس کا عام اعلان ہو۔

تشریح

۱:- ایجاب وقبول کے معنے ہیں کہ ایک فریق کی طرف سے مقرر کردہ شرائط کے مطابق نکاح کی تجویز ہو اور دوسرا فریق اسے قبول کرے۔

معاہدہ نکاح میں ایجاب عموماً عورت کی جانب سے ہوتا ہے قبول مَرد کی جانب سے۔ لیکن ایسا ہونا ضروری نہیں پہلا قول خواہ کسی فریق کی جانب سے ہو ایجاب کہلائے گا اور دوسرے کی جانب سے اس کا مثبت جواب قبول کہلائے گا۔

بعض صورتوں میں جب ایک ہی شخص دونوں جانب سے ولی یا وکیل ہو تو وہ خود ایجاب وقبول کرسکتا ہے۔

ایجاب وقبول کے لئے الفاظ کی کوئی پابندی نہیں۔ الفاظ خواہ کچھ ہوں لیکن واضح اور غیرمبہم ہونے چاہئیں جن سے نکاح اور باہمی رشتہ ازدواج پر رضامندی کا اِظہار ہو اور ایسے اِظہار سے نکاح پر رضامندی کے علاوہ اَور کوئی مفہوم نہ نکلتا ہو[1]

اگر فریقین میں سے کوئی ایک گونگا اور بہرہ ہو تو اشارہ کے ذریعہ سے بھی ایجاب وقبول ہو سکتا ہے بشرطیکہ اشارہ واضح ہو اور اس سے یہ مفہوم نکلتا ہو کہ فریقین زوجیّت کے رشتہ میں

---

[1] زبانی اِظہار کے علاوہ تحریری طور پر بھی رضامندی کا اِظہار کیا جائے تو بلحاظ ثبوت ایسا ایجاب وقبول زیادہ معتبر اور مستند ہوگا۔

منسلک ہو رہے ہیں اور اس پر وہ رضامند ہیں۔

ب :۔ ایک ہی مجلس میں ایجاب وقبول

مجلسِ نکاح میں ایجاب وقبول اصالتاً بھی ہو سکتا ہے اور وکالتاً بھی یعنی لڑکی کے لئے خود مجلس میں حاضر ہو کر ایجاب یا قبول کرنا لازمی نہیں اس کا وکیل اس کی طرف سے رضامندی کا اظہار کر سکتا ہے اور معروف کے لحاظ سے یہ طریق زیادہ پسندیدہ ہے۔

اسی طرح لڑکا بھی اگر مجلسِ نکاح میں موجود نہ ہو تو اس کا وکیل اس کی طرف سے ایجاب یا قبول کر سکتا ہے۔ البتہ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ جو فریق موجود نہیں وہ مُستند اور قابلِ اعتماد زبانی یا تحریری ثبوت کے ذریعہ اپنی رضامندی ظاہر کرے اور اس کی طرف سے وکیل کے تقرر کا ثبوت موجود ہو۔

ج :۔ نکاح کا مناسب اِعلان ضروری ہے۔

نکاح کا اِعلان ایسے رنگ میں ہونا چاہیئے کہ عام لوگوں کو اس کا علم ہو جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نکاح کا اِعلان کرو خواہ دَف کے ذریعہ ہو۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں :۔

اَعْلِنُوْا ھٰذَا النِّکَاحَ وَاجْعَلُوْہُ فِی الْمَسَاجِدِ وَاضْرِبُوْا عَلَیْہِ بِالدُّفِّ [۱]

" یعنی نکاح کا اِعلان کرو۔ مسجد میں پڑھاؤ اور اس کے اِعلان کے لئے دَف بجاؤ "

موجودہ دَور میں اخبارات اور رسائل کے ذریعہ بھی اِعلان کیا جا سکتا ہے۔

خفیہ[۲] نکاح اگرچہ گواہان موجود ہوں ناپسندیدہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خفیہ نکاح کے متعلق فرمایا :۔

" لَا نِکَاحَ اِلَّا بِبَیِّنَۃٍ۔ لَا نِکَاحَ اِلَّا بِشُھُوْدٍ اَلْبَغَایَا اللَّاتِی یَنْکِحْنَ اَنْفُسَھُنَّ بِغَیْرِ بَیِّنَۃٍ " [۳]

یعنی بَیِّنَہ اور گواہوں کے بغیر نکاح درست نہیں۔ وہ عورتیں بدکردار ہیں جو شریعت کے بیان کردہ اصول کے مطابق بَیِّنَہ قائم کئے بغیر اپنا نکاح خود کر لیتی ہیں۔

---

۱ ترمذی کتاب النکاح باب اعلان النکاح و ابن ماجہ صفحہ ۱۳۶

۲ اِعلان کے ذرائع سے گریز کیا جائے۔ خبر کو پھیلنے سے روکا جائے۔

۳ ترمذی کتاب النکاح باب لَا نِکَاحَ اِلَّا بِبَیِّنَۃٍ صفحہ ۱۳۰

نکاح کا اخفاء اگر فاسد[1] اغراض پر مبنی ہو تو عدالت یا قضاء ایسے خفیہ نکاح کو ناجائز قرار دے سکتی ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک ارشاد سے ظاہر ہے جسے حضرت امام مالکؒ نے اِس طرح روایت کیا ہے:۔

عَنْ اَبِی الزُّبَیْرِ الْمَکِّیِّ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اُتِیَ بِنِکَاحٍ لَمْ یُشْھَدْ عَلَیْہِ اِلَّا رَجُلٌ وَ امْرَاَۃٌ فَقَالَ ھٰذَا نِکَاحُ السِّرِّ وَلَا اُجِیْزُہٗ وَلَوْ کُنْتُ تَقَدَّمْتُ فِیْہِ لَرَجَمْتُ۔[2]

یعنی ابی الزبیر مکّی بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک مَرد اور عورت کے نکاح کا معاملہ پیش کیا گیا جس کے صرف ایک مرد اور ایک عورت گواہ تھے اور وہ عام مجلس میں نہیں پڑھا گیا تھا اس پر آپ نے فرمایا "یہ تو خفیہ نکاح ہے مَیں اِسے جائز نہیں سمجھتا اور اگر مَیں نے اس سے پہلے اِس قسم کے نکاح کے ناجائز ہونے کا اِعلان کیا ہوتا تو مَیں ان دونوں کو اس خلاف ورزی کی سخت سزا دیتا۔

○

---

[1] مثلاً پہلی بیوی سے اس نکاح کو خفیہ رکھنا مقصود ہو تا کہ اُس کے حقوق کو نظر انداز کیا جا سکے۔

[2] موطاء امام مالکؒ باب مالا یجوز من النکاح صفحہ ۱۹۴

صحتِ نکاح اور اسکی شرائط

دفعہ نمبر ۸

صحتِ نکاح کے لئے تین بنیادی شرائط ہیں۔

نمبر ۱ : عورت موانع سے خالی ہو۔

نمبر ۲ : عورت اور اس کا ولی دونوں اس نکاح پر راضی ہوں۔

نمبر ۳ : معاہدہ نکاح کے کم ازکم دو گواہ ہوں۔

تشریح

شرط نمبر ۱ ——— موانع نکاح

عورت کے موانع نکاح سے خالی ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس میں کوئی ایسی وجہ نہ ہو جس کی بناء پر اس مرد کا اس عورت سے نکاح نہ ہو سکتا ہو۔ ایسی عورتیں جن سے اس قسم کے موانع کی وجہ سے نکاح نہیں ہو سکتا "محرّمات" کہلاتی ہیں اور ان کی دو قسمیں ہیں۔

ابدی محرّمات :۔ یعنی ایسی عورتیں جن سے کبھی بھی نکاح جائز نہ ہو۔

وقتی محرّمات :۔ یعنی ایسی عورتیں جن سے نکاح کسی شرعی روک کی وجہ سے جائز نہ ہو اور اس روک کے دُور ہو جانے پر نکاح جائز ہو جائے۔

ہر قسم کی محرمات کا بیان قرآن کریم کی سُورۃ النساء کی آیت نمبر ۲۴، ۲۵ میں ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَ اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّ اللّٰهَ

كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ [1]

تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور تمہاری بھتیجیاں اور تمہاری بھانجیاں اور تمہاری رضاعی مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہوا اور تمہاری رضاعی بہنیں اور تمہاری ساسیں اور تمہاری وہ سوتیلی لڑکیاں جو تمہاری ان بیویوں سے ہوں جن سے تم خلوت کر چکے ہوا اور وہ تمہارے گھروں میں پلتی ہوں تم پر حرام کی گئی ہیں، لیکن اگر تم نے ان ماؤں سے خلوت نہ کی ہو تو اُن کی لڑکیوں سے نکاح کرنے میں تم پر کوئی گناہ نہیں اور اسی طرح تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری پُشت سے ہوں تم پر حرام ہیں اور یہ بھی کہ تم دو بہنوں کو اپنے نکاح میں جمع کرو۔ ہاں جو گذر گیا سو گذر گیا۔ اللہ یقیناً بہت بخشنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔

اور پہلے سے منکوحہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں باستثنا ان عورتوں کے جو تمہاری ملکیت میں آجائیں۔ یہ اللہ نے تم پر فرض کیا ہے اور جو ان اوپر کی بیان کردہ عورتوں کے سوا ہوں وہ تمہارے لئے بعد نکاح حلال ہیں۔ یعنی اس طرح سے کہ تم اپنے مالوں کے ذریعہ سے انہیں طلب کرو بشرطیکہ تم شادی کرنے والے ہو زنا کرنے والے نہ ہو۔ پھر یہ شرط بھی ہے کہ اگر تم نے ان سے نفع اُٹھایا ہو تو تم انہیں ان کے مہر بہ مقدارِ موعود ادا کرو۔ اور مہر مقرر ہو جانے کے بعد جس کمی بیشی پر تم باہم راضی ہو جاؤ اس کے متعلق تمہیں کوئی گناہ نہ ہوگا۔ اللہ یقیناً بہت جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

اَبدی محرّمات (بر بنائے نسب)

ا:۔ وہ عورتیں جو مَرد کے اصول میں شمار ہوتی ہیں ان سے نکاح ابدی حرام ہے۔ مثلاً ماں، نانی،

---

[1] سُورۃ النساء آیت ۲۴، ۲۵؛

دادی وغیرہ۔ ماں کی حرمت نصِ صریح سے ثابت ہے جیسا کہ فرمایا:-

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ [1]

یعنی تم پر تمہاری مائیں حرام ہیں۔

اُمَّھَات، اُمٌّ کی جمع ہے جس کے معنے ہیں ماں۔ اور اِس جگہ حقیقی ماں کے علاوہ نانی اور دادی وغیرہ بھی مراد ہیں۔ اِس طرح نانی اور دادی سے صرف ماں کی ماں اور باپ کی ماں مراد نہیں بلکہ ماں کی ماں اور اس سے اُوپر کی مائیں یعنی نانی پڑنانی وغیرہ اور دادی سے دادی پڑدادی وغیرہ سبھی مراد ہیں۔

ب:- وہ عورتیں جو مَرد کی فرع میں شمار ہوتی ہیں ان سے نکاح ابدی حرام ہے مثلاً بیٹی، پوتی، نواسی وغیرہ۔ بیٹی کی حُرمت نصِ صریح سے ثابت ہے جیسا کہ فرمایا:-

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ [2]

یعنی تم پر تمہاری مائیں اور بیٹیاں حرام ہیں۔

بیٹی کے مفہوم میں نواسی، پوتی وغیرہ سبھی آجاتی ہیں۔ احادیث میں ان سب کے لئے بنت کا لفظ استعمال ہؤا ہے۔

ج:- وہ عورتیں جو باپ یا ماں کی فرع یعنی اولاد ہیں ان سے نکاح ابدی حرام ہے مثلاً بہن، بھانجی، بھتیجی۔ بہنوں کی حُرمت اور بھانجیوں اور بھتیجیوں کی حُرمت نصِ صریح سے ثابت ہے جیسا کہ فرمایا:-

وَاَخَوٰتُكُمْ ..... وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ [3]

یعنی تم پر تمہاری بہنیں حرام ہیں اِسی طرح بھائی کی بیٹیاں اور بہن کی بیٹیاں یعنی بھتیجیاں اور بھانجیاں سب حرام ہیں۔

بہن سے مراد تمام قِسم کی بہنیں ہیں خواہ وہ حقیقی ہوں یا سوتیلی۔ اور سوتیلی بہن سے مراد باپ کی طرف سے یا ماں کی طرف سے ہر دو طرح کی بہنیں ہیں کیونکہ ان سب پر بہن کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ بہنوں اور بھائیوں کی اولاد مثلاً بھانجی، بھتیجی اور ان کی اولاد سب ابدی حرام ہیں۔

د:- وہ عورتیں جو مرد کے اپنے اصل بعید (دادا پڑدادا وغیرہ) کی فرع قریب ہوں صرف ان سے نکاح ابدی حرام ہے ان کی اولاد سے نہیں مثلاً پھوپھی اور خالہ وغیرہ سے تو نکاح حرام ہے لیکن

---

[1] [2] [3] سورۃ النساء آیت ۲۴ ؎

ان کی اولاد سے جائز ہے۔

پھوپھی اور خالہ وغیرہ کی حُرمت نصِ صریح سے ثابت ہے جیسا کہ فرمایا:۔

وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ

یعنی تم پر تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں بھی حرام ہیں۔

دادا کی بہن یعنی باپ کی پھوپھی اور نانا کی بہن یعنی ماں کی پھوپھی اور اسی طرح باپ کی خالہ اور ماں کی خالہ بھی اس حُرمت میں شامل ہیں کیونکہ رشتہ میں وہ بھی پھوپھیاں اور خالائیں ہی ہیں۔

پھوپھی اور خالہ وغیرہ کی اولاد سے شادی جائز ہے کیونکہ آیت حرمت میں جہاں بہنوں کی حرمت کا ذکر ہے وہاں بہنوں کی اولاد کی حرمت کا ذکر بھی واضح الفاظ میں ہے لیکن خالہ اور پھوپھی کی حرمت کے ساتھ ان کی اولاد کی حرمت کا ذکر نہیں جو اِس بات کی دلیل ہے کہ پھوپھی اور خالہ کی اولاد سے نکاح جائز ہے اور تعامل بھی اس کے مطابق ہے کیونکہ پھوپھی اور خالہ کی حُرمت اور ان کی اولاد کی عدم حرمت ہر مکتبِ فکر کے فقہاء کے درمیان متفق علیہ ہے۔

اَبدی محرّمات (بر بنائے مصاہرت)

ا:۔ اپنے باپ کی منکوحہ سے نکاح ابدی حرام ہے۔ باپ کی منکوحہ سے نکاح کی حُرمت نصِّ قرآنی سے ثابت ہے جیسا کہ فرمایا:۔

لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ [1]

یعنی ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں۔

اِس حکم میں دادا کی منکوحہ اور نانا کی منکوحہ شامل ہیں کیونکہ عربی لغت کے مطابق "اَبٌ" سے مراد باپ اور باپ سے اوپر کے تمام آباء یعنی دادا۔ نانا وغیرہ سبھی شامل ہیں لہٰذا ان کی منکوحہ بھی باپ کی منکوحہ کے حکم میں شامل ہوگی۔ باپ کی منکوحہ کی حرمت محض عقدِ صحیح سے لازم آجاتی ہے مجامعت اور مباشرت شرط لازمی نہیں۔

ب:۔ ساس۔ ساس کی ماں۔ ساس کی دادی و نانی وغیرہ سے نکاح ابدی حرام ہے۔ ساس اور ساس کی ماں وغیرہ کی حرمت بھی نصِّ صریح سے ثابت ہے جیسا کہ فرمایا:۔

---

[1] سورۃ النسآء آیت ۲۳

وَ اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ [1]

اور تمہاری بیویوں کی مائیں بھی تم پر حرام کی گئی ہیں۔

بعض فقہاء نے اِس بارے میں اِختلاف کیا ہے کہ محض نکاح سے ہی اس کی ماں اور دادی وغیرہ کی حرمت ثابت ہوجاتی ہے یا مجامعت کا ہونا اس حرمت کے لئے ضروری شرط ہے۔ جو لوگ بیوی کے ساتھ مجامعت کو اس حرمت مصاہرت کی شرط سمجھتے ہیں ان کا اِستدلال یہ ہے کہ آیت کریمہ وَ اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ [2] میں دَخَلْتُمْ بِهِنَّ کی شرط کا تعلق " امّہات اور ربائب" دونوں کے ساتھ ہے لہٰذا جب تک مجامعت نہ ہو نہ ساس سے نکاح حرام ہے اور نہ ربیبہ کی حرمت لازم آتی ہے اس کے برعکس جمہور فقہاء اور جماعتِ احمدیہ کا مذہب یہ ہے کہ محض نکاح سے ہی بیوی کی ماں وغیرہ کی حُرمت ثابت ہوجاتی ہے اور آیت مذکورہ میں " دَخَلْتُمْ بِهِنَّ" کی شرط کا تعلق صرف "ربائب" کے ساتھ ہے اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ کے ساتھ نہیں۔

جمہور کی اِس دلیل کی تائید عمرو بن شعیبؒ کی روایت سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے اپنے باپ کی وساطت سے اپنے دادا سے کی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اگر کوئی شخص ایک عورت سے نکاح کرے تو اس کے بعد اس کے ساتھ مجامعت کرے یا نہ کرے اس شخص پر اس عورت کی ماں حرام ہوجاتی ہے۔

اِس روایت کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَيُّمَا رَجُلٍ نَكَحَ اِمْرَاَةً فَدَخَلَ بِهَا اَوْلَمْ يَدْخُلْ فَلَا تَحِلُّ لَهٗ اُمُّهَا۔ [3]

مشہور صحابی حضرت زید بن ثابتؓ نے بھی اِسی مسلک کی صحت کو ثابت کیا ہے۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:۔

سُئِلَ زَيْدُ بْنِ ثَابِتٍ عَنْ رَجُلٍ تَزَوَّجَ اِمْرَاَةً ثُمَّ فَارَقَهَا قَبْلَ اَنْ يُصِيْبَهَا هَلْ تَحِلُّ لَهٗ اُمُّهَا فَقَالَ زَيْدُ بْنِ ثَابِتٍ لَا اَلْاُمُّ مُبْهَمَةٌ لَيْسَ فِيْهَا شَرْطٌ

---

[1] سورۃ النسآء آیت ۲۴ [2] سورۃ النسآء آیت ۲۴

[3] بدایۃ المجتہد کتاب النکاح الفصل الثانی فی المصاہرۃ جلد ۲ صفحہ ۲۸

وَ إِنَّمَا الشَّرْطُ فِي الرَّبَائِبِ ۔ ؎۱

یعنی حضرت زید بن ثابتؓ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص کسی عورت سے شادی کرے اور پھر رخصتانہ سے پہلے اسے طلاق دے دے تو کیا وہ شخص اس عورت کی ماں سے نکاح کر سکتا ہے۔حضرت زیدؓ نے اس کا یہ جواب دیا کہ قرآن کریم نے اُمَّھٰتُکُمْ میں اُمّ کو عام رکھا ہے اور یہ نہیں فرمایا کہ تمہاری اس بیوی کی ماں جس سے تم مباشرت کر چکے ہو۔اس لئے بیوی کی ماں سے نکاح حرام ہونے کے لئے مباشرت شرط نہیں صرف نکاح شرط ہے۔ البتہ بیوی کی بیٹی جو اس کے دوسرے خاوند سے ہے اس کے حرام ہونے کے لئے مباشرت کی شرط ہے۔اگر مباشرت نہیں ہوئی اور طلاق ہو گئی ہے تو اس بیوی کی لڑکی یعنی ربیبہ سے طلاق دینے والا نکاح کر سکتا ہے۔

بیٹے، پوتے اور نواسے کی بیوی وغیرہ سے نکاح ابدی حرام ہے اور نصِ صریح سے ثابت ہے جیسا کہ فرمایا:-

وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ؎۲

یعنی تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری نسل سے ہیں وہ بھی تم پر حرام ہیں۔بیٹے کے ساتھ پوتے اور نواسے کی بیویاں بھی اسی حکم میں شامل ہیں۔اِس حرمت کے لئے بھی مباشرت اور مجامعت کی شرط نہیں محض بیٹے کے نکاح سے ہی یہ حرمت واقع ہو جاتی ہے۔

ج:- "مِنْ اَصْلَابِكُمْ" کی قید سے یہ واضح ہے کہ "متبنیٰ" یعنی مُنہ بولا بیٹے کی بیوی اس حرمت کے حکم میں شامل نہیں اس سے نکاح ہو سکتا ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ○ ؎۳

یعنی جب زید نے اس عورت کے بارہ میں اپنی خواہش پوری کر لی یعنی طلاق دے دی تو ہم نے اس عورت کا تجھ سے بیاہ کر دیا تا کہ مومنوں کے دِلوں میں اپنے لے پالکوں

؎۱ مؤطا امام مالکؒ کتاب النکاح باب ما لا یجوز من نکاح الرجل ص۱۹۲

؎۲ سورۃ النسآء آیت ۲۴ ؎۳ سورۃ الاحزاب آیت ۳۸

کی بیویوں سے جن کو طلاق مل گئی ہے نکاح کرنے کے متعلق کوئی خلش نہ رہے اور خدا کا فیصلہ بہرحال پورا ہو کر رہنا تھا۔

د:۔ کسی مرد کا اپنی بیوی کی بیٹی یعنی ربیبہ سے نکاح ابدی حرام ہے۔ ربیبہ سے مراد مدخولہ بیوی کے پہلے خاوند کی ایسی لڑکی ہے جس نے اس کے گھر میں اور اس کی سرپرستی میں پرورش پائی ہو۔

ربیبہ کی حرمت بھی نص صریح سے ثابت ہے جیسا کہ فرمایا:۔

وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ [1]

یعنی تمہاری وہ سوتیلی لڑکیاں جو تمہاری ان بیویوں سے ہوں جن سے تم خلوت کر چکے ہو اور تمہارے گھروں میں پلی ہوں تم پر حرام کی گئی ہیں۔

اس بارہ میں کوئی اختلاف نہیں کہ ربیبہ کی حرمت کے لئے بیوی یعنی ربیبہ کی ماں سے مباشرت اور مجامعت ضروری ہے۔ اگر بیوی سے مباشرت نہ ہوئی ہو اور علیحدگی ہو گئی تو ایسی بیوی کے پہلے خاوند کی لڑکی سے نکاح حرام نہیں ہے البتہ فقہاء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ آیا بیوی کے پہلے خاوند کی بیٹی کا دوسرے خاوند کے گھر میں پرورش پانا بھی اس حرمت کے لئے شرط ہے یا نہیں کیونکہ آیت مذکورہ بالا میں "ربائب" کے متعلق "فِيْ حُجُوْرِكُمْ" کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مدخولہ عورتوں کی وہ بیٹیاں مراد ہیں جو دوسرے خاوندوں کے گھروں میں پرورش پا رہی ہوں۔

جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ ربیبہ سے نکاح ہر حال میں حرام ہو گا خواہ اس نے اپنے سوتیلے باپ کے گھر پرورش پائی ہو یا نہ پائی ہو۔

احمدیہ مسلک جمہور فقہاء کے مطابق ہے یعنی ربیبہ کا دوسرے خاوند کے گھر میں پرورش پانا اس کی حرمت کے لئے شرط نہیں ہے۔ اس مسلک کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ اگر ربائب کا خاوندوں کے گھر میں پلنا شرط ہوتا تو آیت میں جہاں یہ کہا گیا ہے کہ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وہاں یہ الفاظ بھی ہوتے وَ اِنْ لَّمْ تَكُنَّ فِيْ حُجُوْرِكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ۔ [2] پس معلوم ہوا کہ اس آیت میں حرمت کے لئے صرف "دَخَلْتُمْ بِهِنَّ" بطور شرط ہے "فِيْ حُجُوْرِكُمْ" بطور شرط نہیں ہے بلکہ بطور واقعہ اس کا ذکر ہے کہ عموماً ایسا ہوتا ہے۔

---

[1] [2] سورۃ النسآء آیت ۲۴

ابدی محرّمات (بربنائے رضاعت)

ا:- وہ رشتے جو بربنائے نسب حرام ہیں اگر وہی رشتے بربنائے رضاعت قائم ہوں تو ان سے بھی نکاح ابدی حرام ہے۔مثلاً رضاعی ماں، رضاعی بہن، رضاعی نواسی، رضاعی پوتی، رضاعی بیٹی، رضاعی خالہ، رضاعی پھوپھی وغیرہ۔ البتہ حرمت بربنائے رضاعت صرف دُودھ پینے والے تک محدود رہتی ہے اسکے بہن بھائی اس سے متاثر نہیں ہوتے۔رضاعی رشتوں میں رضاعی ماں اور رضاعی بہنوں کی حرمت نصِ صریح کی بناء پر ہے جیساکہ فرمایا:-

وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ [1]

یعنی تمہاری وہ مائیں بھی تم پر حرام ہیں جنہوں نے تم کو دُودھ پلایا ہے اور تمہاری رضاعی بہنیں بھی۔

باقی رضاعی رشتوں کی حرمت نصِ حدیث پر مبنی ہے جن کا ذکر شق "ب" میں آئے گا۔

حرمتِ رضاعت محض ایک دو مرتبہ دُودھ چُوس لینے سے واقع نہیں ہوتی۔حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لَا تُحَرِّمُ الْمَصَّةُ وَلَا الْمَصَّتَانِ اَوِ الرَّضْعَةُ وَالرَّضْعَتَانِ [2]

یعنی ایک دو گھونٹ یا ایک دو مرتبہ دُودھ پینے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔

"رَضْعَةٌ" دراصل ایک مرتبہ سیر ہوکر دُودھ پینے کو کہتے ہیں اور بچہ اوسطاً دن میں پانچ مرتبہ دُودھ پیتا ہے اور ایک حدیث سے ثابت ہے کہ پانچ بار دُودھ پینے سے حرمت رضاعت قائم ہوتی ہے پس اگر کوئی بچہ کم ازکم پانچ مرتبہ سیر ہوکر دُودھ پیئے خواہ مختلف اوقات میں تو اس سے حرمت ثابت ہو جائے گی اس سے کم پر نہیں۔روایت کے الفاظ یہ ہیں:-

قَالَتْ عَائِشَةُ اُنْزِلَ فِي الْقُرْاٰنِ عَشْرُ رَضَعَاتٍ مَعْلُوْمَاتٍ فَنَسَخَ مِنْ ذٰلِكَ خَمْسًا وَصَارَ اِلٰى خَمْسِ رَضَعَاتٍ مَعْلُوْمَاتٍ۔ [3]

---

[1] سورۃ النساء آیت ۲۴

[2] ابن ماجہ باب لا تحرم المصّۃ والمصّتان ص۱۳۹ وابوداؤد ص۲۸۳ ج۱ وترمذی ص۱۳۷ ج۱

[3] ترمذی ابواب الرضاع باب لا تحرم المصّۃ الخ ص۱۳۷ ج۱

یعنی پہلے دس بار دُودھ پینے سے حرمت قائم ہونے کا حکم تھا پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا اور پانچ بار دُودھ پینے سے حرمت ثابت ہونے کا قانون مقرر ہوُا۔

اکثر ائمہ کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ رضاعت کی عمر یعنی دو سال کی عمر کے اندر اندر دُودھ پینے سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔ امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ رضاعت مجاعت سے ہوتی ہے اور مجاعت اس بھوک کو کہتے ہیں جو رضاعت کی عمر کے اندر بچہ دُودھ کے لئے محسوس کرتا ہے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں:۔

اِنَّمَا الرَّضَاعَةُ مِنَ الْمَجَاعَةِ [1]

یعنی رضاعت اس عمر میں دودھ پینے کا نام ہے جبکہ بچہ کی بھوک دُور کرنے کا زیادہ تر انحصار دُودھ کی خوراک پر ہو۔

ایک اَور روایت کے الفاظ یہ ہیں:۔

لَا يُحَرِّمُ مِنَ الرَّضَاعِ اِلَّا مَا فَتَقَ الْاَمْعَاءَ فِي الثَّدْيِ وَكَانَ قَبْلَ الْفِطَامِ [2]

یعنی دُودھ پینے سے حرمت اس وقت قائم ہوتی ہے جبکہ دُودھ سے بچہ پیٹ بھرے۔ یعنی دُودھ اس کی خوراک ہو اور دُودھ چھڑانے کی عمر سے پہلے اس نے کسی دوسری عورت کا دُودھ پیا ہو۔

اس بارہ میں صاحب بدایۃ المجتہد علامہ ابن رشدؒ لکھتے ہیں:۔

اِتَّفَقُوْا عَلٰى اَنَّ الرَّضَاعَ يُحَرِّمُ فِي الْحَوْلَيْنِ وَاخْتُلِفَ فِيْ رِضَاعِ الْكَبِيْرِ فَقَالَ مَالِكٌ وَ اَبُوْحَنِيْفَةَ وَالشَّافِعِيُّ وَكَافَّةُ الْفُقَهَاءِ لَا يُحَرِّمُ رِضَاعُ الْكَبِيْرِ [3]

یعنی علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بچہ اگر دو سال کی عمر میں دُودھ پیئے تو رضاعت ثابت ہو گی اور بڑی عمر کا بچہ اگر دُودھ پیئے تو رضاعت ثابت نہیں ہو گی۔ امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور اکثر فقہاء کا یہی مسلک ہے۔

پس فقہاء کی ان تصریحات اور متبینہ روایات کی بناء پر فقہ احمدیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی بچہ رضاعت

---

[1] ابوداؤد باب فی رضاعۃ الکبیر صـ ۲۸۱
[2] ترمذی کتاب الرضاع باب ان الرضاعۃ لا تحرم الا فی الصغر صـ ۱۳۷
[3] بدایۃ المجتہد کتاب النکاح الفصل الثالث فی مانع الرضاع صـ ۳۰ ج ۲

کی عمر کے دَوران پانچ مرتبہ پیٹ بھر کر دُودھ پی لے تو حرمت ثابت ہو گی ورنہ نہیں۔

ب:۔ دُودھ پینے والے لڑکے یا لڑکی کا رشتہ دُودھ پلانے والی کی اولاد کے علاوہ اس کے یا اس کے خاوند کے دوسرے رشتہ داروں سے بھی نہیں ہو سکتا۔

رضاعی ماں اور بہن کے علاوہ دیگر رضاعی رشتوں کی حرمت حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بناء پر ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

یَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعِ مَا یَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ [1]

یعنی دُودھ پینے والے پر رضاعت کی وجہ سے وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں "ابو القعیس" کے بھائی "افلح" آیت حجاب نازل ہونے کے بعد میرے پاس آئے اور اندر آنے کی اجازت چاہی لیکن مَیں نے انہیں اجازت نہ دی۔ بعد میں مَیں نے اس کے متعلق حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا وہ تمہارا چچا ہے کیونکہ وہ تمہارے رضاعی باپ ابو القعیس کا بھائی ہے اِس لئے اسے آنے کی اجازت دے دو۔ مَیں نے عرض کی یارسول اللہؐ مجھے دُودھ تو ایک عورت نے پلایا ہے مرد نے نہیں پلایا۔ تو آپؐ نے فرمایا۔ نہیں وہ تمہارا چچا ہے اور تمہارے پاس آسکتا ہے۔ [2]

لعان

جس عورت سے اُس کے خاوند نے لعان کیا ہو اور اس وجہ سے اُن دونوں میں جدائی ہو گئی ہو تو وہ عورت اور مرد آئندہ کبھی آپس میں نکاح نہیں کر سکتے۔ تاہم بعض فقہاء نے لعان کو وقتی مانع قرار دیا ہے۔ [3]

وقتی محرّمات

ایسی عورتیں جن سے نکاح کسی شرعی روک کی وجہ سے جائز نہ ہو اور روک دُور ہو جانے پر نکاح

---

[1] ابن ماجہ کتاب النکاح باب ما یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب ص۱۳۹

[2] ابوداؤد کتاب النکاح باب فی لبن الفحل ص۲۸۱/۱

[3] نیل الاوطار باب لا یجتمع المتلاعنان ابداً ص۲۷۲/۶

جائز ہو جائے "وقتی محرّمات" کہلاتی ہیں اور اس کی مندرجہ ذیل صورتیں ہیں :۔

ا :۔ دو بہنوں سے ایک ہی وقت میں نکاح۔

دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنا نصِّ صریح کی رُو سے حرام ہے جیسا کہ فرمایا :۔

وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ۔ [1]

یعنی تمہارے لئے حرام ہے کہ دو بہنوں کو بیک وقت اپنی بیوی بنا کر رکھو۔

دو بہنوں سے اگر ایک ہی ساتھ نکاح کیا جائے تو دونوں نکاح باطل ہوں گے، لیکن اگر یکے بعد دیگرے نکاح کرنے سے دو بہنیں اکٹھی ہو جائیں تو پہلا نکاح صحیح ہو گا اور دوسرا باطل۔ کیونکہ دوسرا نکاح نادرست ہوا ہے۔ عدّت کے دوران بھی معتدہ بیوی کی بہن سے نکاح جائز نہیں۔ اگر لاعلمی سے ایک بہن کی موجودگی میں دوسری بہن سے نکاح ہو جائے تو وہ نکاح فاسد[2] کے حکم میں ہے اور دوسری بہن کی تفریق لازمی ہے۔

ب :۔ ایک مرد کے نکاح میں بیک وقت ایسی دو عورتیں جمع نہیں ہو سکتیں جو آپس میں خالہ بھانجی یا پھوپھی بھتیجی ہوں۔

خالہ بھانجی اور پھوپھی بھتیجی کو ایک مرد کے نکاح میں جمع کرنے کی حرمت نصِّ حدیث پر مبنی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "کوئی شخص اپنے عقد میں کسی عورت کو اس کی پھوپھی کے ساتھ یا کسی عورت کو اس کی خالہ کے ساتھ جمع نہ کرے۔" حدیث کے الفاظ یہ ہیں :۔

نَهٰى اَنْ تُزَوَّجَ الْمَرْاَةُ عَلٰى عَمَّتِهَا اَوْعَلٰى خَالَتِهَا [3]

حضرت ابنِ عباسؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حُرمت کی عِلّت قطع رحمی ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

فَاِنَّكُمْ اِذَا فَعَلْتُمْ ذٰلِكَ فَقَدْ قَطَعْتُمْ اَرْحَامَكُمْ [4]

یعنی اگر تم نے پھوپھی بھتیجی یا خالہ بھانجی کو ایک ساتھ نکاح میں رکھا تو تم قطع رحمی کے گناہ

---

[1] سورۃ النسآء آیت ۲۴

[2] نکاح فاسد کے لئے دیکھیں دفعہ نمبر ۱۷،۱۴

[3] ترمذی کتاب النکاح باب لا تنکح المراۃ علی عمتھا اوعلی خالتھا ص۱۳۴ ج۱

[4] طبرانی من حدیث ابن عباسؓ بحوالہ نصب الرایۃ ص۱۳ ج۳

کے مرتکب ہوگے۔
ظاہر ہے کہ اس ممانعت سے شارعؑ کا منشاء صلہ رحمی اور ایسی قریبی رشتہ داری میں مودّت ومحبّت کو فروغ دینا اور قطع رحمی کے حالات سے بچانا ہے۔
ج :۔ منکوحہ غیر سے نکاح جائز نہیں جب کہ اس کا پہلا نکاح قائم ہو۔ یہ حرمت بھی نصِ صریح کی بناء پر ہے جیسا کہ فرمایا :۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ

یعنی پہلے سے منکوحہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں۔
آیت مذکورہ بالا کے آغاز میں "حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ" کے الفاظ ہیں جو وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ پر بھی حاوی ہیں۔
پس کسی منکوحہ عورت سے نکاح نصِ صریح کی بناء پر حرام ہے۔ اگر عدمِ علم کی وجہ سے ایسا نکاح ہو جائے اور فریقین میں مباشرت بھی ہو جائے تو یہ وطئی بالشبہ کے حکم میں ہو گا اور علم ہوتے ہی تفریق لازم آئے گی۔ دیگر معاملات یعنی حق مہر، نسب وغیرہ نکاح فاسد کے حکم میں ہوں گے۔ [1]
د :۔ چار بیویوں کی موجودگی میں پانچواں نکاح جائز نہیں —— یہ حرمت قرآن شریف کی اس آیت سے ثابت ہے :۔

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً [2]

یعنی تم اپنی پسند کے مطابق دو دو تین تین چار چار عورتوں سے شادی کر سکتے ہو اور اگر تمہیں ڈر ہو کہ تم عدل سے کام نہیں لے سکو گے تو پھر ایک عورت سے ہی شادی کرو۔
حرمت کا یہ حکم آیت مذکورہ سے دلیل خطاب کے تحت نکلتا ہے اور اس کی تائید حدیث شریف سے ہوتی ہے۔ ترمذی کی روایت ہے کہ غیلان بن سلمۃ الثقفی نے جب اسلام قبول کیا تو ان کے عقد میں دس بیویاں تھیں ان بیویوں نے بھی ان کے ساتھ اسلام قبول کر لیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اختیار دیا کہ وہ ان میں سے چار بیویاں رکھ کر باقی کو الگ کر دیں۔ [3]

---

[1] مزید تفصیل کے لئے دیکھیں دفعہ نمبر ۱۴، نمبر ۱۷ نکاح فاسد و ثبوت نسب ؛ [2] سورۃ النسآء آیت ۴
[3] ترمذی کتاب النکاح باب فی الرجل یسلم وعندہٗ عشر نسوۃ ص ۱۳۴

غرض قرآن کریم کی آیت مذکورہ اور حدیث شریف سے یہی ثابت ہے کہ چار کی موجودگی میں پانچواں نکاح جائز نہیں۔

ھ :۔ معتدہ سے نکاح جائز نہیں۔

معتدہ ایسی عورت کو کہتے ہیں جو عدت[1] گذار رہی ہو۔ عدت خواہ طلاق کی ہو یا بیوگی کی اور عرصہ عدت خواہ حیض ہو یا وضع حمل کا یا مہینوں کا کسی صورت میں عدت کے دَوران نکاح جائز نہیں جیسا کہ فرمایا :۔

وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ [2]

یعنی جب تک عدت کا حکم اپنی میعاد کو نہ پہنچ جائے اس وقت تک تم نکاح باندھنے کا پختہ ارادہ نہ کرو۔

د :۔ مشرک یا مُشرکہ سے نکاح جائز نہیں البتہ کتابیہ عورت سے نکاح جائز ہے۔

مشرک یا مشرکہ سے نکاح کی حرمت نصِ صریح کی بناء پر ہے جیسا کہ فرمایا :۔

لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ [3]

یعنی تم مُشرک عورتوں سے جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں نکاح نہ کرو اور ایک مومن لونڈی ایک مشرک عورت سے خواہ وہ تمہیں کتنی ہی پسند ہو یقیناً بہتر ہے اور مشرکوں سے جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں مسلمان عورتیں مت بیاہو اور ایک مومن غلام ایک مشرک آزاد سے خواہ وہ تمہیں کتنا ہی پسند ہو یقیناً بہتر ہے۔

مشرکہ سے نکاح بھی ثبوتِ نسب کی حد تک نکاح فاسد کے حکم میں ہے۔ یہ نکاح باطل اور کالعدم ہے اور اگر یہ مشرکہ ایمان لے آئے تو پھر نیا نکاح ضروری ہوگا۔

ز :۔ مطلقہ بتّہ اپنے سابق خاوند سے نکاح نہیں کر سکتی یعنی جس نے اسے طلاق بتّہ دی ہے۔

---

[1] عدت کی تفصیل کے لئے دیکھیں دفعہ نمبر ۴۸

[2] سورۃ البقرہ آیت ۲۳۶

[3] سورۃ البقرہ آیت ۲۲۲

جس عورت کو مخصوص طریق کے مطابق الگ الگ وقتوں میں وقفہ وقفہ کے بعد تین طلاقیں اسکے خاوند نے دی ہوں تو دوبارہ وہ آپس میں نکاح نہیں کر سکتے سوائے اس کے کہ وہ عورت کسی اَور شخص سے شادی کرے اور پھر کسی طبعی یا قدرتی وجہ سے اس سے علیحدگی ہو جائے تو اس طرح " حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ "[۲] یعنی نکاح ثانی کی شرط پوری ہو جانے کی وجہ سے وہ اپنے اس خاوند سے بھی نکاح کر سکتی ہے جس نے اسے طلاق بتہ دی تھی۔[۳]

شرط نمبر ۲ :۔ صحتِ نکاح کے لئے دوسری شرط یہ ہے کہ عورت اور اس کا ولی دونوں اس نکاح پر راضی ہوں۔

تشریح الف :۔ شرعی نکاح کے لئے ضروری ہے کہ نہ صرف عورت خود نکاح کے لئے راضی ہو بلکہ اس کا ولی بھی نکاح پر رضامند ہو۔ نہ تو محض ولی کی رضامندی سے نکاح ہو سکتا ہے اور نہ صرف عورت کی رضامندی سے۔

اگر لڑکی نابالغ ہے تو اس کی رضامندی اس کے بالغ ہونے تک معلّق رہتی ہے جب وہ خود بالغ ہو جائے تو وہ اپنے خیارِ بلوغ کا حق استعمال کرتے ہوئے نابالغی کا یہ نکاح قائم بھی رکھ سکتی ہے اور مسترد بھی کر سکتی ہے۔

فِقہ احمدیہ کی رُو سے لڑکی خواہ بالغ ہو یا نابالغ۔ باکرہ ہو یا ثیبہ اس کا نکاح ولی کی رضامندی کے بغیر درست نہیں کیونکہ صحتِ نکاح کے لئے جہاں عورت کی اپنی رضامندی ضروری ہے وہاں ولی کی رضامندی بھی لازمی ہے۔

فِقہ احمدیہ کا یہ مسلک ارشادات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خلفائے راشدینؓ کے تعامل پر مبنی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور خلفائے راشدینؓ کے چند حوالے درج ذیل ہیں:۔

حضرت ابو بردہؓ اپنے والدؓ سے روایت کرتے ہیں لَا نِکَاحَ اِلَّا بِوَلِیٍّ یعنی عورت کا نکاح ولی کی اجازت کے بغیر نہیں ہوتا۔ یہ روایت مختلف سندات سے مروی ہے جو صحیح اور ثابت ہیں۔[۴]

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھیں دفعہ نمبر ۳۵ طلاق بتہ ؛ [۲] سورۃ البقرہ آیت ۲۳۱

[۳] " " " نیز اسکی تشریح کی جز "ج" ؛ [۴] ابوداؤد کتاب النکاح باب فی الولی جلد اوّل ص ۲۸۴

ترمذی کتاب النکاح باب لا نکاح الّا بولی ص ۱۳۱ ؛ ابن ماجہ کتاب النکاح باب لا نکاح الا بولی ص ۱۳۵ ؛

اسی مضمون کی روایات حضرت علی بن ابی طالبؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت انس بن مالکؓ سے بھی مروی ہیں۔[1]

اسی طرح اُمّہات المؤمنین میں سے حضرت عائشہؓ، حضرت اُمّ سلمہؓ اور حضرت زینب بنت جحشؓ سے بھی صحیح سند کے ساتھ اس مضمون کی روایات موجود ہیں۔[2]

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر کوئی عورت ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے تو اس کا نکاح باطل ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:-

أَيُّمَا امْرَأَةٍ نَكَحَتْ بِغَيْرِ إِذْنِ وَلِيِّهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ۔[3]

اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لَا تُزَوِّجُ الْمَرْأَةُ نَفْسَهَا فَإِنَّ الزَّانِيَةَ هِيَ الَّتِي تُزَوِّجُ نَفْسَهَا [4]

یعنی کوئی عورت بغیر ولی کے خود اپنا نکاح نہ کروائے اور جو عورت بغیر ولی کے خود کو کسی کی زوجیت میں دے دے تو وہ گویا زانیہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:-

لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ وَشَاهِدَيْ عَدْلٍ [5]

یعنی کسی عورت کا نکاح ولی کی اجازت اور دو عادل گواہوں کے بغیر درست نہیں۔

خلفائے راشدینؓ کا تعامل بھی اس مسلک کی تائید کرتا ہے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں اس مسلک کو درست سمجھا اور اس پر سختی سے عمل کروایا اور اعلان کیا کہ ولی کی اجازت کے بغیر نکاح درست نہیں ہوگا۔

---

[1] نیل الاوطار کتاب النکاح باب لا نکاح الا بولی ص ۱۱۸، ۱۱۹ جلد ۶

[2] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

[3] ترمذی کتاب النکاح باب لا نکاح الا بولی جلد اول ص ۱۳۰

[4] دارقطنی کتاب النکاح جلد ۲ ص ۳۸۴

[5] 〃 〃 〃 ص ۳۸۲

ایک دفعہ ایک عورت نے اپنے جائز ولی کی بجائے کسی دوسرے شخص کو اپنا ولی بنا کر نکاح کر لیا۔ جب حضرت عمرؓ کے پاس یہ خبر پہنچی تو آپؓ نے نکاح کو ناجائز قرار دیا اور ولی بننے والے اور نکاح کرنے والے دونوں کو کوڑے لگوائے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں:۔

عَنْ عِكْرِمَةَ بْنِ خَالِدٍ قَالَ جَمَعَتِ الطَّرِيْقُ رَكْبًا فَجَعَلَتْ اِمْرَأَةٌ مِنْهُمْ ثَيِّبٌ أَمْرَهَا بِيَدِ رَجُلٍ غَيْرِ وَلِيٍّ فَأَنْكَحَهَا فَبَلَغَ ذٰلِكَ عُمَرَ فَجَلَّدَ النَّاكِحَ وَالْمُنْكِحَ وَرَدَّ نِكَاحَهَا۔ [1]

اسی طرح حضرت علیؓ بھی اس بارہ میں سختی فرمایا کرتے تھے اور ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرنیوالے کو کوڑے لگوایا کرتے تھے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں:۔

مَا كَانَ أَحَدٌ مِنْ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَشَدَّ فِي النِّكَاحِ بِغَيْرِ وَلِيٍّ مِنْ عَلِيٍّ وَكَانَ يَضْرِبُ فِيْهِ۔ [2]

ب: استحقاق ولایت نکاح

ولایت کا حق کسے ہے اس لحاظ سے سب سے مقدم ولی عورت کا باپ ہے اس کے بعد علی الترتیب دادا، سگا بھائی، سوتیلا بھائی، چچا وغیرہ قریبی عصبات عورت کے نکاح کے لئے ولی ہو سکتے ہیں۔

نکاح کی ولایت کا مندرجہ بالا حق رشتہ داروں میں اقربیت کی بنیاد پر چلتا کوئی رشتہ دار زیادہ قریبی ہوگا اسی نسبت سے اسے حقِ ولایت حاصل ہوگا۔

قریبی ولی کی موجودگی میں دور کے ولی کا حقِ ولایت مؤثر نہیں ہوگا تاہم سب بھائی حقِ ولایت میں یکساں ہیں ان میں سے کوئی بھی عاقل بالغ بھائی بہن کے نکاح کے لئے ولی بن سکتا ہے عمر کا فرق مؤثر نہیں ہوگا۔

ج:۔ فقہ احمدیہ کی رُو سے ولی کے مفہوم میں عمومیت ہے جدّی قریبی رشتہ دار بھی ولی ہے اور جماعتِ احمدیہ کے امام کو بھی ولایتِ عامہ حاصل ہے۔ پس اگر کسی عورت کا کوئی قریبی جدّی رشتہ دار ولی نہ ہو یا انصاف سے کام نہ لے اور اس حق کے استعمال میں لڑکی کا مفاد اس کے مدّنظر نہ ہو اور لڑکی پر جبر کر رہا ہو تو لڑکی یا اس کے وکیل مجاز کی درخواست پر امام جماعت خود یا اس غرض کے لئے

---

[1] دارقطنی کتاب النکاح صـ ۳۸۳

[2] 〃 〃 〃 صـ ۳۸۵

ان کا مقرر کردہ نمائندہ کسی اور مناسب آدمی کو ولیٔ نکاح مقرر کر سکتا ہے جو لڑکی کی رضامندی اور اسکے مفاد کے مطابق یہ فریضہ انجام دے گا اور اس کی یہ کارروائی درست اور معتبر ہوگی۔

عام حالات میں عورت نکاح کی ولی نہیں بن سکتی۔ مثلاً ماں، دادی، نانی، بہن، پھوپھی وغیرہ ولیٔ نکاح نہیں ہوں گی۔

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے اپنے خاندان کے ایک لڑکے اور لڑکی کے نکاح کی بات طے کی۔ جب دیگر امور طے پا گئے تو آپ نے خاندان کے ایک شخص کو کہا کہ وہ اِس نکاح کی بحیثیت ولی اجازت دے کیونکہ عورتوں کو نکاح کی ولایت کا اختیار نہیں ہے۔ [۱]

شرط نمبر ۳ دو گواہوں کا ہونا

صحتِ نکاح کے لئے کم از کم دو گواہان کا ہونا ضروری ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بغیر گواہوں کے نکاح نہیں ہوتا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

تشریح: ا:۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا نِکَاحَ اِلَّا بِوَلِیٍّ وَشَاھِدَیْ عَدْلٍ [۲]

ب:۔ عَنْ عَائِشَۃَؓ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا بُدَّ فِی النِّکَاحِ مِنْ اَرْبَعَۃٍ اَلْوَلِیِّ وَالزَّوْجِ وَالشَّاھِدَیْنِ۔ [۳]

حضرت عائشہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ

لَا نِکَاحَ اِلَّا بِوَلِیٍّ وَشَاھِدَیْ عَدْلٍ وَمَا کَانَ مِنْ نِکَاحٍ عَلٰی غَیْرِ ذٰلِکَ فَھُوَ بَاطِلٌ [۴]

یعنی کوئی نکاح ولی کی رضامندی اور دو عادل گواہوں کے بغیر درست نہیں ہوتا اور جو نکاح اس کے بغیر ہو وہ باطل ہے۔

گواہوں کے لئے عاقل بالغ ہونا ضروری ہے۔ مرد گواہ رکھے جائیں بشرطِ ضرورت ایک مرد اور

---

[۱] محلی ابن حزم جلد ۹ ص ۴۵۳

[۲] دارقطنی کتاب النکاح ص ۳۸۲

[۳] 〃 〃 〃 ص ۳۸۳

[۴] اخرجه ابن حبان فی صحیحه بحواله نصب الرایه ص ۱۶۷ ج ۳

دو عورتیں بھی انعقادِ نکاح کے گواہ بن سکتے ہیں۔
جس شخص سے بوقتِ ضرورت سچی گواہی کی توقع نہ ہو اس کو گواہ بنانا بیکار ہے۔

مہر

دفعہ نمبر ۹

مہر اُس مالی منفعت کا نام ہے جو نکاح کے نتیجہ میں خاوند کی طرف سے بیوی کو واجب الادا ہے اور جس پر بیوی کلی تصرّف کا حق رکھتی ہے۔

تشریح نکاح کی صحت کے لئے پہلے سے حق مہر مقرر کرنا ضروری نہیں جیسا کہ قرآن کریم کی اِس آیت سے ظاہر ہے:۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً [1]

یعنی تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو اس وقت بھی طلاق دے دو جبکہ تم نے ان کو چھوا تک نہ ہو یا مہر نہ مقرر کیا ہو۔

البتہ رخصتی ہو جانے کے بعد پورا حق مہر خود بخود واجب ہو جاتا ہے اور اگر حق مہر متعین نہ ہو تو مہر مثل کی ادائیگی واجب ہوتی ہے خواہ نکاح کے وقت مہر کا ذکر آیا ہو یا نہ آیا ہو۔ اِس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی نکاح بغیر "حق مہر" کے نہیں۔

حق مہر کی ادائیگی خاوند کے ذمّہ واجب ہے جیسا کہ فرمایا:۔

---

[1] سورۃ البقرہ آیت ۲۳۷

وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَۃً [1]

یعنی عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی کے ساتھ ادا کرو۔

مہر بیوی کا حق ہے وہی اس کی مالک ہے وہ جس طرح چاہے اسے اپنے مَصرف میں لا سکتی ہے خاوند کی وفات پر اگر مہر واجب الادا ہو تو دیگر قرضوں کی طرح حق مہر کی ادائیگی بھی خاوند کے ترکہ سے لازمی ہے۔

○

مہرِ مسمّٰی

دفعہ نمبر ۱

وہ مہر ہے جو فریقین کی رضامندی سے بوقتِ نکاح طے پایا جائے اور اعلانِ نکاح میں اس کا ذکر آجائے۔

تشریح جو حق مہر بوقتِ نکاح مقرر کیا جائے اور اعلانِ نکاح میں اس کا ذکر آئے "مہرِ مسمّٰی" کہلاتا ہے۔ ادائیگی کے لحاظ سے مہرِ مسمّٰی کی رواجاً دو قسمیں بیان کی گئی ہیں۔

ا:۔ مہرِ معجّل ——————— ب:۔ مہرِ مؤجّل

ا:۔ مہرِ معجّل مقررہ مہر کا وہ حصّہ ہے جو بوقتِ نکاح فوری طور پر ادا کر دیا جائے یا بیوی کے مطالبہ پر عند الطلب ادا کرنا تسلیم کیا جائے یا معاہدہ نکاح میں مہر کی ادائیگی کے وقت کا کوئی ذکر نہ ہو۔ ایسے مہر کی عدم ادائیگی کی صورت میں بیوی خاوند کو اپنے نفس پر قدرت دینے سے انکار کر سکتی ہے اور

---

[1] سورۃ النسآء آیت ۵

عورت کے مطالبہ پر قضاء فوری ادائیگی پر خاوند کو مجبور کر سکتی ہے۔

ب :- مہرِ مؤجّل مقررہ مہر کا وہ حصّہ ہے جو زوجین کی علیحدگی یا خاوند کی وفات کے بعد قابلِ ادا ہو جیسا کہ ذکر آ چکا ہے۔ مہر ایک قرضہ ہے جو خاوند کے ترکہ میں سے اس کے دیگر قرضوں کی طرح ادا ہونا چاہیئے۔

مہر مسمّٰی کے بالمقابل مہر مجہول ہے جس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں جیسے کسی مجہول جنس یا نوع کا ذکر کرنا لیکن اس کی تعیین نہ کرنا مثلاً یہ کہا جائے کہ میں حق مہر میں کوئی جانور، زمین، مکان یا کار وغیرہ دوں گا مگر اس کی تعیین نہ کی جائے یا اس کی مالیت کی تعیین نہ کی جائے یا اعلانِ نکاح میں مہر کا ذکر نہ ہو یا فریقین کے درمیان مہر کی مقدار میں تنازعہ ہو اور ثبوت موجود نہ ہو۔ ان سب صورتوں میں اگر باہمی رضامندی سے کوئی بات طے نہ ہو سکے اور تنازعہ عدالت میں جائے تو مہر مثل[1] واجب الادا ہوگا۔

○

مہرِ معجّل

دفعہ نمبر ۱۱

مہرِ معجّل کی صورت میں بیوی جب چاہے مہر کا مطالبہ کر سکتی ہے۔

تشریح چونکہ عورت مہر کی کلیۃً حقدار ہے اور یہ نکاح کے ساتھ ہی خاوند پر واجب ہو جاتا ہے۔ اِس لئے عورت جب چاہے اس کا مطالبہ کر سکتی ہے یہاں تک کہ ائمہ اور فقہاء اِس بات پر متفق ہیں کہ ابتداءً جب کہ ابھی تعلقاتِ زوجیت قائم نہ ہوئے ہوں عورت کو اختیار ہے کہ وہ خاوند کو تا ادائیگی مہر تعلقاتِ زوجیت قائم کرنے سے روک دے۔ اگر تعلقاتِ زوجیت قائم ہو چکے ہوں تو اس صورت

---

[1] مہر مثل کی تشریح کے لئے دیکھیں دفعہ نمبر ۱۲

میں بھی امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عورت کا یہ اختیار باقی رہتا ہے کہ وہ کسی وقت بھی تا ادائیگی مہر حقوقِ زوجیت ادا کرنے سے انکار کر دے۔

اگر رخصتانہ سے قبل طلاق دے دی جائے تو عورت نصف مہر مقررہ کی حقدار ہو گی جیسا کہ فرمایا

اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ [1]

یعنی اگر تم انہیں قبل اس کے کہ تم نے انہیں چھوا ہو لیکن مہر مقرر کر دیا ہو طلاق دیدو تو اس صورت میں جو مہر تم نے مقرر کیا ہو اس کا آدھا ان کے سپرد کرنا ہو گا۔

اگر رخصتانہ سے قبل خاوند مر جائے تو عورت پورے مقررہ مہر کی حقدار ہو گی اور وراثت سے بھی اسے حصہ ملے گا۔ [2]

اگر نکاح کے وقت مہر مقرر نہ ہوا ہو اور قبل از رخصتانہ طلاق ہو جائے یا خاوند فوت ہو جائے تو پھر مہر مثل کا نصف یا پورا مہر مثل ادا کرنا واجب نہیں حسبِ استطاعت مناسب تحائف دے کر عورت کو رخصت کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا ۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ [3]

یعنی تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو اس وقت بھی طلاق دے دو جبکہ تم نے انہیں چھوا تک نہ ہو یا مہر نہ مقرر کیا ہو۔ اور چاہیئے کہ اس صورت میں تم انہیں مناسب طور پر کچھ سامان دے دو۔ یہ امر دولتمند پر اس کی طاقت کے مطابق لازم ہے اور نادار پر اسکی طاقت کے مطابق۔ ہم نے ایسا کرنا نیکوکاروں پر واجب کر دیا ہے۔

---

[1] سورۃ البقرہ آیت ۲۳۸

[2] الاحوال الشخصیہ علی المذاہب الخمسہ ص۶۲ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ص۱۰۸

[3] سورۃ البقرہ آیت ۲۳۷

دفعہ نمبر ۱۲

معاہدہ نکاح میں مہر کی عدمِ تعیین کی صورت میں بوقت تنازعہ قاضی جو مہر فریقین کی حیثیت کے مطابق متعیّن کرے وہ "مہرِ مثل" ہے۔

تشریح مہرِ مثل درحقیقت فقہاء کی وضع کردہ اِصطلاح ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ بوقتِ نکاح اگر کسی عورت کا مہر مقرر نہ ہوا ہو تو قاضی عورت اور مرد کے حالات کو دیکھ کر جو مہر مقرر کرے وہ مہر مثل کہلاتا ہے۔ صاحبِ ہدایہ مہرِ مثل کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

مہرِ مثل کی تعیین کے لئے یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ حُسن وجمال، سیرت وکردار اور علم وعمل کے لحاظ سے اس عورت کی جو رشتہ دار عورتیں اس کے ہم پایہ ہیں ان کا مہر کتنا مقرر ہُوا تھا۔

اِس جائزہ میں عورت کے باپ کی طرف سے رشتہ دار عورتوں کو مدِّنظر رکھا جائے گا مثلاً بہنیں، پھوپھیاں اور چچازاد بہنیں وغیرہ ماں کی طرف سے رشتہ دار عورتیں مثلاً خالائیں، خالہ زاد بہنیں وغیرہ کو اس جائزہ میں مدِنظر نہیں رکھا جاتا۔[1]

بعض فقہاء کے نزدیک مہرِ مثل کی تعیین کے لئے عورتوں کے شوہروں کے حسب اور ان کی مالی استطاعت کو بھی مدِنظر رکھا جانا چاہیئے۔[2]

ہمارے نزدیک تنازعہ کی صورت میں قاضی حالات کا جائزہ لے کر جس مقدارِ مہر کا فیصلہ کرے گا وہی مہرِ مثل ہو گا۔ جائزہ کے انداز حالات کے لحاظ سے مختلف ہو سکتے ہیں تنازعہ کی بالعموم مندرجہ ذیل

---

[1] کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ کتاب النکاح مبحث ما یعتبر بہ مہر مثل ص۱۲۸/۴
ھدایہ کتاب النکاح ص۳۰۳ مطبع مجیدی کانپور۔

[2] فتح القدیر جلد ۲ ص۴۷۱

صورتیں ہوسکتی ہیں :-

ل :- اگر کوئی مرد اپنا نکاح کرے اور وہ کوئی مہر مقرر نہ کرے اور بعد میں مقدارِ مہر کے بارہ میں تنازعہ اُٹھ کھڑا ہو۔

ب :- کوئی شخص کسی عورت سے اِس شرط پر نکاح کرے کہ حق مہر کوئی نہ ہوگا۔

ج :- مہر مجہول مقرر کرے مثلاً نکاح کے وقت جنس یا نوع کا ذکر تو ہو مگر اس کی تعیین نہ ہوئی ہو۔

د :- مہر میں کوئی ایسی چیز مقرر کی جس کی کوئی مالیّت نہیں یا جسے "مال" نہیں کہا جاسکتا۔

اِن سب صورتوں میں نکاح صحیح ہوجائے گا اور مہر لازم ہوگا لیکن نکاح کے بعد اگر مہر کی مقدار میں تنازعہ ہو تو قاضی کے فیصلہ کے مطابق مہر مثل کی ادائیگی واجب ہوگی۔

مہر کی مقدار

دفعہ نمبر ۱۳

مہر کی رقم خاوند کی مالی حیثیت کے مطابق ہونی چاہیئے۔

تشریح فقہاءِ سلف نے حق مہر کی زیادہ سے زیادہ کوئی حد مقرر نہیں کی۔ ان کی تمام تر توجہ اقل مقدار کی طرف رہی ہے۔ زمانہ ماضی میں چونکہ رجحان یہ تھا کہ کم سے کم مہر کتنا ہوسکتا ہے اور یہ اِس وجہ سے تھا کہ حق مہر کی اہمیّت واضح ہو اور معقولیت کی حد سے کم حق مہر مقرر نہ کیا جائے۔ چنانچہ اُس زمانہ کے معیارِ زندگی کے مطابق یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے فقراء المہاجرین نے جو حق مہر کئے تھے ان کی مقدار کو کم ازکم حق مہر قرار دیا گیا اور معیار یہ ٹھہرا کہ فقراء المہاجرین نے جو حق مہر باندھے اس سے کم حق مہر کسی صورت میں نہ ہو۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کم سے کم مقدار مہر دس درہم یا اس کی مساوی مالیّت کی کوئی شئے

ہوسکتی ہے۔ برِصغیر میں غالباً اسی بناء پر کم سے کم مہر کی مقدار ساڑھے بتیس (۲/۱-۳۲) روپے قرار دی گئی لیکن فی زمانہ ساڑھے بتیس روپے حق مہر مقرر کرنا ائمہ سلف کے قلیل ترین معیار اور مختلف زمانوں میں قدرِ زر کے اختلاف کے لحاظ سے درست معلوم نہیں ہوتا[1]۔ کیونکہ یہ حق مہر کی اہمیت اور حکمت کے منافی ہے۔

ائمہ سلف نے زیادہ سے زیادہ حق مہر کی کوئی حد مقرر نہیں کی کیونکہ یہ اُس زمانے کا مسئلہ نہ تھا لیکن فی زمانہ یہ رجحان پیدا ہوگیا ہے کہ نمائش یا دباؤ کے پیشِ نظر بھاری رقوم حق مہر کے طور پر مقرر کی جائیں اگرچہ نیت اس کی ادائیگی کی نہیں ہوتی حالانکہ شریعت کا منشاء یہ ہے کہ مہر ادائیگی کی نیت سے ہی مقرر کیا جائے اور پھر اسے ادا بھی کیا جائے۔ اِس لئے زیادہ حق مہر باندھنے کے غیر صحتمند رجحان کی روک تھام فی زمانہ لازمی ہے۔ چنانچہ اِس زمانہ کے حَکم و عَدل حضرت بانیٔ سِلسلہ احمدیہ اِس بارہ میں فرماتے ہیں :-

"ہمارے مُلک میں یہ خرابی ہے کہ نیت اَور ہوتی ہے اور محض نمود کیلئے لاکھ لاکھ روپے کا مہر ہوتا ہے۔ صرف ڈراوے کے لئے یہ لکھا جایا کرتا ہے کہ مَرد قابو میں رہے۔ اور اس سے پھر دوسرے نتائج خراب نکل سکتے ہیں۔ نہ عورت والوں کی نیت لینے کی ہوتی ہے اور نہ خاوند کے دینے کی۔

میرا مذہب یہ ہے کہ جب ایسی صورت میں تنازعہ آپڑے تو جب تک اس کی نیت ثابت نہ ہو کہ ہاں رضا و رغبت سے وہ اسی قدر مہر پر آمادہ تھا جس قدر کہ مقرر شدہ ہے تب تک مقرر شدہ نہ دلایا جاوے اور اس کی حیثیت اور رواج وغیرہ کو مدِنظر رکھ کر پھر فیصلہ کیا جاوے کیونکہ بدنیتی کی اتباع نہ شریعت کرتی ہے اور نہ قانون۔"[2]

بعد ازاں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ حضرت بانیٔ سِلسلہ عالیہ احمدیہ کے اِس ارشاد کی روشنی میں مہر کی اِنتہائی حد مقرر کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی چنانچہ سیّدنا حضرت مصلح موعود (اللہ آپ سے راضی ہو) نے اِس سلسلہ میں فرمایا :-

"مَیں نے مہر کی تعیین چھ ماہ سے ایک سال تک کی آمد کی ہے۔ یعنی مجھ سے کوئی مہر کے

---

[1] درہم کی قیمت اس زمانہ میں اُس کی قوتِ خرید کو مدِّنظر رکھ کر مقرر ہونی چاہیئے کیونکہ اُس وقت ایک درہم کی ایک بکری یا دو بکریاں ملتی تھیں۔

[2] بدر جلد ۲ نمبر ۱۶ - صفحہ ۱۲۳ - ۸ مئی ۱۹۰۳ء۔

متعلق مشورہ کرے تو مَیں یہ مشورہ دیا کرتا ہوں کہ اپنی چھ ماہ کی آمد سے ایک سال تک کی آمد بطور مہر مقرر کر دو اور یہ مشورہ میرا اس امر پر مبنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعودؑ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے الوصیّت کے قوانین میں دسویں حصّہ کی شرط رکھوائی ہے۔ گویا اسے بڑی قربانی قرار دیا ہے۔ اس بناء پر میرا خیال ہے کہ اپنی آمدنی کا دسواں حصّہ باقی اخراجات کو پورا کرتے ہوئے مخصوص کر دینا معمولی قربانی نہیں بلکہ ایسی بڑی قُربانی ہے کہ جس کے بدلے میں ایسے شخص کو جنّت کا وعدہ دیا گیا ہے اِس حساب سے ایک سال کی آمد جو گویا متواتر دس سال کی آمد کا دسواں حصّہ ہوتا ہے بیوی کے مہر میں مقرر کر دینا مہر کی اغراض کو پورا کرنے کیلئے بہت کافی ہے بلکہ میرے نزدیک اِنتہائی حد ہے۔" [1]

پس جماعتِ احمدیہ کا مَسلک یہ ہے کہ حق مہر نہ اتنا کم ہو کہ وہ عورت کے وقار کے منافی محسوس ہو اور شریعت کے ایک اہم حکم سے مذاق بن جائے اور نہ اتنا زیادہ کہ اس کی ادائیگی تکلیف مالا یطاق ہو جائے۔ اس اصول کی بناء پر خاوند کی جو بھی مالی حیثیت ہو اس کے مطابق چھ ماہ سے بارہ ماہ تک کی آمدنی کے برابر حق مہر کو معقول اور مناسب خیال کیا گیا ہے۔

○

نکاح

دفعہ نمبر ۱۴۱

نکاح اپنے اِنعقاد اور اثرات کے اِعتبار سے صحیح ہوتا ہے یا فاسد یا باطل۔

تشریح اگر کسی نکاح میں صحتِ نکاح کی جملہ شرائط پائی جائیں تو وہ نکاح صحیح ہو گا اور اگر صحتِ نکاح کی

---

[1] الفضل ۱۲ر دسمبر ۱۹۴۰ء

شرائط کے لحاظ سے اس میں کوئی ایسا سُقم ہو جس کا ازالہ ہو سکتا ہے تو وہ نکاح فاسد کہلائے گا اور جب یہ سُقم دُور ہو جائے تو یہی نکاح صحیح ہو جائے گا اور اگر کوئی نکاح بنیادی طور پر حرام ہو یعنی اس کا سقم دُور نہ ہو سکتا ہو تو وہ نکاح باطل ہو گا اور کوئی چیز باطل نکاح کو درست نہیں کر سکتی۔

نوٹ :- ہر ایک کی تعریف و تفصیل آئندہ دفعات میں ملاحظہ ہو۔

○

نکاح صحیح

دفعہ نمبر ۱۵

نکاح صحیح وہ نکاح ہے جو شریعت کے مطابق ہو اور صحتِ نکاح کی جملہ شرائط اس میں موجود ہوں۔

تشریح صحتِ نکاح کے لئے جیسا کہ قبل ازیں بیان ہو چکا ہے[1] فریقین کی رضامندی، عورت کے ولی کی رضامندی، دو عاقل بالغ گواہوں کی گواہی، حق مہر کا وجوب اور مناسب طریق پر نکاح کا اعلان ضروری امور ہیں۔ علاوہ ازیں یہ شرط بھی ہے کہ عورت شرعی موانع سے خالی ہو[2] ان سب شرائط کی پابندی کے ساتھ جو نکاح ہو گا شریعت کی رُو سے وہ نکاح صحیح ہو گا۔

○

---

[1] دیکھیں دفعہ نمبر ۸ صحتِ نکاح

[2] ان موانع کی تفصیل کے لئے دیکھیں دفعہ نمبر ۸ اور اس کی شرائط شرط نمبر ا مع تشریح

دفعہ نمبر ۱۶

نکاح صحیح کے نتیجہ میں فریقین کو حقِ مساکنت حقِ مقاربت حقِ توارث اور حقِ ثبوت نسب اور اس قسم کے دوسرے سب معاشرتی حقوق حاصل ہو جاتے ہیں۔

تشریح نکاح صحیح کے نتیجہ میں زوجین کو کچھ حقوق حاصل ہوتے ہیں اور کچھ فرائض ان پر عائد ہوتے ہیں جیسا کہ فرمایا:-

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ [1]

یعنی جس طرح ان عورتوں پر کچھ ذمہ داریاں ہیں ویسے ہی مطابق دستور انہیں کچھ حقوق بھی حاصل ہیں۔ ہاں مردوں کو اُن پر ایک طرح کی فوقیت حاصل ہے۔

فریقین کے حقوق و فرائض

نکاح کے نتیجہ میں جو حقوق دوطرفہ طور پر حاصل ہوتے ہیں وہ حقِ مساکنت، حقِ مقاربت، حقِ ثبوت نسب، حقِ توارث اور حرمت مصاہرت ہیں یعنی میاں بیوی دونوں اکٹھے ایک جگہ رہنے کا حق رکھتے ہیں کسی دوسرے کو اس پر اعتراض کا حق نہیں اس طرح دونوں حسب حصّہ شرعی ایک دوسرے کے ترکہ میں حقدار ہوں گے۔ دونوں کے لئے حرمت مصاہرت واقع ہوگی یعنی مصاہرت کی بناء پر واقع ہونیوالے ایسے رشتے حرام ہوں گے جن کا ذکر دفعہ نمبر ۸ اور اس کی شرط نمبر ۱ کی تشریح میں گذر چکا ہے۔

بیوی کے حقوق و فرائض

۱:- نکاح صحیح کے نتیجہ میں بیوی مہر کی حقدار ہو جاتی ہے اور خاوند پر اس کی ادائیگی واجب ہے [2]

---

[1] سورۃ البقرہ آیت ۲۲۹

[2] تفصیل کے لئے دیکھیں دفعہ نمبر ۹

ب :- بیوی نان و نفقہ کی حقدار ہوتی ہے اور خاوند نان و نفقہ ادا کرنے کا ذمہ دار ہے[1]

ج :- بیوی کو خاوند کے گھر میں رہنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابل پر بیوی پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ خاوند کے ازدواجی حقوق ادا کرے۔ اس پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ خاوند کی وفادار اور معروف طریق پر اس کی اطاعت گذار ہو۔

تیسرا فرض اس پر یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ طلاق یا خاوند کی وفات کی صورت میں عدّت گذارے۔

خاوند کے حقوق و فرائض

ا :- خاوند نکاح کے نتیجہ میں بیوی سے ازدواجی تعلقات یعنی مقاربت کا حقدار ہوتا ہے۔ اِسی طرح گھریلو کام کاج اور بچّوں کی پرورش کے سلسلہ میں بیوی سے مدد لینے کا حق بھی خاوند کو حاصل ہوتا ہے۔

ب :- خاوند پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بیوی کا حقِ مقاربت اور نان و نفقہ ادا کرے اور اس کی رہائش کا اِنتظام کرے۔ نفقہ کے بارہ میں خاوند کی ذمہ داری کُلّی ہے بیوی کے صاحبِ جائیداد یا صاحبِ ثروت ہونے سے خاوند کی یہ ذمہ داری ساقط نہیں ہوتی[2]

ج :- خاوند بیوی کو حق مہر ادا کرنے کا ذمہ دار ہے[3]

د :- ایک سے زائد بیویوں کی صورت میں خاوند ان کے ساتھ مساوی سلوک کرنے کا پابند ہے۔

○

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھیں دفعہ نمبر ۴۴

[2] " " " "

[3] " " " دفعہ نمبر ۹

نکاحِ فاسد

دفعہ نمبر ۷۱

ایسا نکاح جس میں صحتِ نکاح کی ابدی حرمت کی شرط کے علاوہ کوئی اور شرط مفقود ہو مثلاً بوقتِ نکاح ولی کی اجازت نہ لی گئی ہو یا ایجاب وقبول کے وقت گواہاں موجود نہ ہوں یا نکاح مؤقت ہو۔

تشریح نکاح فاسد اور اس کے احکام کے بارہ میں یہ جاننا ضروری ہے کہ نکاح فاسد کا حکم کسی نکاح پر صرف ایسی صورت میں لگایا جاتا ہے جب کہ اس نکاح کے نتیجہ میں فریقین کے درمیان ازدواجی تعلق قائم ہو جائے اگر ازدواجی تعلق قائم نہ ہؤا ہوا اور نکاح کا فساد علم میں آجائے تو نکاح واجب الفسخ ہوگا اور فوری تفریق لازمی ہوگی اور فریقین کو کوئی حقوق حاصل نہیں ہوں گے، لیکن اگر فسخ سے پہلے ازدواجی تعلق قائم ہو جائے تو شبہہ فی العقد کی بناء پر حدِ زنا ساقط ہوگی۔ اگر وجۂ فساد عارضی ہے تو فسخ کے فیصلہ سے پہلے اس کے دُور ہونے پر پہلا نکاح ہی بحال رہے گا اور اعلانِ نکاح کے بعد سے ہی فریقین کے جملہ حقوق اور ان کی تمام ذمہ داریاں قائم متصوّر ہوں گی لیکن اگر فساد بنیادی شرائط میں پایا جائے تو ایسا نکاح بہر حال لازم الفسخ ہوگا جیسے عدّت کے دَوران کیا ہؤا نکاح واجب الفسخ ہے اور اس وجۂ فساد کے دُور ہو جانے کے بعد اگر فریقین ازدواجی تعلق قائم کرنا چاہیں تو دوبارہ نکاح پڑھنا ضروری ہوگا۔

دفعہ نمبر ۱۸

اگر نکاحِ فاسد کے فسخ ہونے سے پہلے فریقین میں ازدواجی تعلق قائم ہو گیا ہو تو حرمت مصاہرت واقع ہو گی اولاد ثابت النسب ہو گی اور مہرِ مثل یا مہرِ مسمّٰی میں سے کم تر رقم خاوند کے ذمّہ قابلِ ادا ہو گی اور بصورت تفریق عورت کے لئے عدّت گذارنا لازمی ہو گا۔

تشریح

نکاحِ فاسد کے نتیجہ میں اگر ازدواجی تعلقات قائم نہ ہوئے ہوں تو جیسا کہ اُوپر بیان ہو چکا ہے علم ہونے پر نکاح فسخ کر دیا جائے گا اور فریقین میں تفریق کروا دی جائے گی۔ اِس صورت میں اس نکاح کے کوئی اثرات مرتب نہ ہوں گے۔ لیکن اگر ازدواجی تعلقات قائم ہو گئے ہوں تو مصاہرت لازم آئے گی یعنی بیوی کی ماں، بیوی کی بیٹی، سب حرام ہوں گی۔ اسی طرح یہ عورت اپنے اس خاوند کے والد سے نکاح نہیں کر سکے گی اور نہ اس کے بیٹے سے۔

شریعت کے تمام احکام میں چونکہ سہولت مدّنظر ہے اِس لئے گو نکاح فاسد ہے لیکن اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی اولاد ثابت النسب ہو گی شریعت حتّی الامکان بچّے کو ناجائز یا حرام کے حکم سے بچانا چاہتی ہے اِس لئے جہاں کہیں تھوڑا سا سہارا بھی ملتا ہو خواہ شبہ فی الفعل ہو یا شبہ فی العقد وہاں اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی اولاد کو ولدالحرام کی تہمت سے بچانا مدّنظر رکھا گیا ہے۔

نکاحِ فاسد کے نتیجہ میں حق مہر بھی اسی صورت میں واجب الادا ہے جب تعلقاتِ ازدواجی قائم ہو چکے ہوں ورنہ نہیں البتہ مہرِ مثل اور مہرِ مسمّٰی میں سے جو کم تر ہو گا وہ واجب الادا ہو گا۔ اِسی طرح سے گو نکاح فاسد ہے لیکن اگر ازدواجی تعلقات قائم ہو گئے ہوں تو بصورت تفریق عورت پر عِدّت لازم آئے گی تاکہ استقرارِ حمل کے بارہ میں تسلّی کر لینے کا موقع مل سکے۔

○

دفعہ نمبر ۱۹

نکاحِ باطل ایسا نکاح ہے جس کی کوئی شرعی بنیاد نہ ہو جیسے کسی دوسرے کی منکوحہ سے نکاح یا محرماتِ ابدی سے نکاح۔

تشریح جو نکاح نصوصِ قطعیہ کے خلاف ہو وہ باطل ہے۔ فقہاء نے لفظ باطل اور لفظ فاسد کے اِستعمال میں بعض جگہ غلطی کھائی ہے اور فاسد نکاح کے لئے باطل اور نکاحِ باطل کے لئے فاسد کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ یہ غلطی اِس وجہ سے لگی ہے کہ بعض اوقات ایک نکاح بظاہر باطل ہوتا ہے لیکن اس پر جو اثرات و احکام مرتّب ہوتے ہیں وہ فاسد نکاح کے ہوتے ہیں مثلاً ایک شخص غلطی اور لاعلمی میں معتدہ غیر سے نکاح کرلیتا ہے یا لاعلمی میں محرماتِ ابدی میں سے کسی سے نکاح کرلیتا ہے۔ بظاہر تو یہ نکاح باطل کی تعریف میں آتا ہے لیکن اثرات اور نتائج کے لحاظ سے اس پر نکاحِ فاسد کے احکام مرتّب ہوتے ہیں۔ یہ امر سمجھ لینا چاہیئے کہ ان صورتوں میں جو نکاحِ فاسد کے بعض احکام مرتّب ہوتے ہیں وہ نکاح کے احکام نہیں بلکہ وطئی اور جماع کے احکام ہیں اور یہ احکام فقہاء نے صرف اِس لئے مرتّب کئے ہیں تاکہ اس جماع کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی اولاد کو ولد الحرام ہونے کے حکم سے بچایا جاسکے کیونکہ شبہ فی المحل یا شبہ فی الفعل کی وجہ سے یہ زنا نہیں ہے لیکن اس قسم کے نکاح کے بعد مرد اور عورت کے درمیان اگر تعلقاتِ زوجیت قائم نہیں ہوئے تو اس صورت میں سب کے نزدیک اس پر نکاحِ باطل کے احکام لاگو ہوں گے یعنی ہر دو میں فی الفور تفریق کرا دی جائے گی مرد کے لئے وطئی کرنا حرام ہوگا اور عورت کے لئے اس مرد کو مباشرت کا موقع دینا حرام ہوگا۔

غرضیکہ ایک ہی فعل پر دو قسم کے احکام نافذ ہونے کی وجہ سے فقہاء نے "فاسد" اور "باطل" کے الفاظ اِستعمال کرنے میں تسامح سے کام لیا ہے تاہم بنیادی اصول یہی ہے کہ جو نکاح نصوصِ قطعیہ کے خلاف ہو وہ باطل ہے اور جس میں نکاحِ صحیح کی شرائط کے لحاظ سے کوئی ایسا سقم ہو جس کا بسہولت ازالہ ہوسکتا ہو وہ نکاح فاسد ہے۔

○

دفعہ نمبر ۲۰

نکاح باطل کالعدم کے حکم میں ہے اور اس کے نتیجہ میں فریقین کو کوئی حقوق حاصل نہیں ہوتے ۔

تشریح نکاح باطل چونکہ فعل حرام ہے اِس لئے خواہ خلوت صحیحہ میسّر بھی آجائے اس سے (سوائے بعض استثنائی[1] صورتوں کے) کوئی حقوق پیدا نہیں ہوتے بلکہ فریقین جملہ حقوق سے محروم ہوتے ہیں۔ عورت کے لئے حق مہر اور عدّت نہیں۔ فریقین ایک دوسرے کے وارث نہیں۔ اِسی طرح اولاد ثابت النسب نہیں ہو گی۔

○

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھیں دفعہ نمبر ۱۹ کی تشریح ۔

تعدّدِ ازدواج

دفعہ نمبر ۲۱

مرد شرعی ضرورت اور عدل و مساوات کی شرائط کی پابندی کے ساتھ ایک سے زائد نکاح کرسکتا ہے لیکن بیک وقت چار سے زائد بیویاں نہیں رکھ سکتا۔ [1]

تشریح قانونِ فطرت اور معاشرہ کے بعض مخصوص حالات کے پیشِ نظر تعدّد ازدواج ایک اہم معاشرتی ضرورت ہے۔

اِسلام جو کہ دینِ فطرت ہے اس نے اس ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا اور بعض شرائط کی پابندی کے ساتھ تعدّد ازدواج کی اجازت دی ہے۔ اگر کسی بھی صورت میں تعدّد ازدواج کی اجازت نہ ہو اور اسے ایک دینی حکم قرار دیا جائے تو معاشرے کو سخت مشکلات اور ناگفتہ بہ قباحتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اِس بناء پر قرآن کریم نے بعض مصالح کے پیشِ نظر مردوں کو ایک سے زائد شادیوں کی اجازت دی ہے ایسے مصالح کی بعض صورتیں یہ ہوسکتی ہیں۔

ا:۔ قومی حالات کا تقاضا مثلاً کسی جنگ کے نتیجہ میں مردوں کی تعداد بہت کم ہوجائے اور عورتوں کی تعداد نسبتاً بہت زیادہ ہوجائے۔

ب:۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ عورت بیمار ہو اور ازدواجی ذمّہ داریوں کی ادائیگی کے قابل نہ ہو ایسی صورت میں اگر مرد دوسری شادی کرنے کی اجازت چاہے تو عدل و مساوات کی شرط کے ساتھ اسے دوسری شادی کی اجازت نہ دینا اِنسانی فطرت پر ظلم کے مترادف اور جذبۂ تراحم کے خلاف اقدام ہوگا۔

---

[1] سورۃ النسآء آیت نمبر ۴

دوسری شادی کی اجازت نہ دینے کی وجہ سے دوہی صورتیں پیدا ہوسکتی ہیں ایک یہ کہ بیوی کی بیماری کی وجہ سے خاوندبھی عملاً تجرّد کی زندگی پرمجبور ہوجائے جو بذاتِ خود قانونِ فطرت سے بغاوت ہے دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ مرد خود کو دوسری شادی کے لئے آزاد کرنے کی خاطر بیمار بیوی کو طلاق دیدے اور خود دوسری شادی کرلے حالانکہ پہلی بیمار بیوی علیحدگی نہیں چاہتی۔

پس اِن حالات میں معقول صورت وہی ہے جو اسلام نے پیش کی ہے اور عدل ومساوات کی شرط کے ساتھ دوسری شادی کرنے کی اجازت دی ہے تاکہ بیمار بیوی اپنے سہارے سے بھی محروم نہ ہو اور اس کا شوہر محض بیوی کی بیماری کی وجہ سے فطرت سے بغاوت پر بھی مجبور نہ ہو۔

یہی صورت عورت کے بانجھ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوسکتی ہے اس کے علاوہ مرد طبعی طور پر بھی بعض اَوقات ایک سے زائد شادیوں کی ضرورت محسوس کرسکتا ہے۔ اِس صورت میں مغربی معاشرہ اپنے افراد کو دوسری شادی کی اجازت تو نہیں دیتا مگر شادی کے بغیر جنسی تعلق کو برداشت کرلیتا ہے لیکن اِسلام شادی کے بغیر جنسی تعلق کو روا نہیں رکھتا بلکہ اس کے نزدیک معاشرے کی صحت مند تشکیل اور ذمّہ داری کے احساس کو اجاگر کرنے کے لئے غیر شادی شدہ ملاپ کی بجائے تعدّدِ ازدواج کی اجازت دینا اقرب الی الصواب ہے۔

اِسلام نے ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت عدل ومساوات کی شرط کے ساتھ مشروط کی ہے جیساکہ فرمایا:۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً [1]

یعنی اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ تم عدل نہ کرسکوگے تو ایک ہی عورت سے نکاح کرو۔

لہٰذا اگر کوئی شخص ایک سے زائد شادیاں کرنے میں عدل کی شرط کو ملحوظ نہ رکھ سکے یا پہلی بیوی سے ظالمانہ سلوک روا رکھے اور دوسری شادی میں اس کی رضامندی کو ملحوظ نہ رکھے نہ اسے اطلاع دے اور نہ اس کے حقوق کی ادائیگی کرے اور نہ سب کے ساتھ عدل قائم رکھنے کا یقین دلائے تو حالات کے مطابق مناسب قانون کے ذریعہ ایسے شخص کو ایک سے زائد شادیاں کرنے سے روکا جاسکتا ہے یا پہلی بیوی کو اس کے جملہ حقوق کے ساتھ "حقِ علیحدگی" دیا جاسکتا ہے۔

[1] سورۃ النسآء آیت ۴

ولادت اور نسب

دفعہ نمبر ۲۲

کسی بچّے کا نسب ولادت سے یا مَرد کے اقرار سے ثابت ہوتا ہے۔

○

دفعہ نمبر ۲۳

ولادت سے نسب ثابت ہونے کے لئے ضروری ہے کہ

ا :۔ بچّہ نکاح صحیح یا نکاح فاسد کے بعد پیدا ہو۔

ب :۔ مرد اور عورت مباشرت کے قابل ہوں۔

ج :۔ بچّہ کی ولادت نکاح کے بعد طبعی مدّتِ حمل میں واقع ہوئی ہو۔

○

دفعہ نمبر ۲۴

مجہول النسب بچّے کا نسب مرد کے اِقرار سے متعیّن ہوسکتا ہے بشرطیکہ بچّہ عمر کے لحاظ سے اقرار کرنے والے کی بیٹی یا بیٹا ہوسکتا ہو اور حالاتِ معلومہ کے مطابق ایسا ہونا عقلاً محال نہ ہو۔

○

دفعہ نمبر ۲۵

شرائط مندرجہ دفعہ نمبر ۲۴ کے تحت اقرار نسب کے بعد بچہ کا نسب متعین ہو جائے گا اور بعد ازاں اقرار کرنے والا اس سے منکر نہیں ہو سکے گا۔

تشریح

دفعات نمبر ۲۳، نمبر ۲۴، نمبر ۲۵

ا:۔ اسلام میں بچے کے نسب کو حتی الامکان صحیح قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر ولادت ایسے حالات میں ہوئی ہے جن کا ذکر دفعہ نمبر ۲۳ میں ہے تو بچے کا نسب ولادت سے بلا دعویٰ ثابت ہوگا اور اس میں کلام کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔

دعویٰ کے بغیر محض ولادت سے نسب ثابت کرنے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ بچہ نکاح کے بعد پیدا ہوا ہو نکاح سے پہلے بچے کی پیدائش سے خود بخود نسب ثابت نہیں ہوتا جیسا کہ دفعہ نمبر ۲۴ میں مذکور ہے۔ پس ولادت سے نسب ثابت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بچہ نکاحِ صحیح یا نکاحِ فاسد کے بعد پیدا ہوا ہو۔ دفعہ مذکور میں زور نکاح کے صحیح یا فاسد اور اس کے معتبر ہونے پر نہیں بلکہ نکاحِ صحیح یا نکاحِ فاسد کے بعد پیدائش پر ہے۔ البتہ نکاحِ باطل کے بعد عام حالات[1] میں پیدائش سے نسب ثابت نہیں ہوتا۔

دوسری شرط یہ ہے کہ مرد اور عورت مباشرت کے قابل ہوں۔ اگر خاوند یقینی طور پر نابالغ ہو تو محض ولادت کی بناء پر بچے کا نسب ثابت نہیں ہوگا۔

تیسری شرط یہ ہے کہ بچہ نکاح کے بعد کم از کم چھ ماہ کا عرصہ پورا ہونے یا اس کے بعد پیدا ہوا ہو۔ اگر بچہ چھ ماہ سے پہلے پیدا ہوا ہو تو محض ولادت سے نسب ثابت نہیں ہوگا۔

اس سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ نکاح کے بعد بچے کی ولادت طبعی مدتِ حمل میں ہوئی ہو۔ طبعی مدتِ حمل سے مراد کم سے کم مدتِ حمل بھی ہو سکتی ہے اور زیادہ سے زیادہ مدتِ حمل بھی۔ حمل کی کم از کم مدت نکاح کے بعد چھ ماہ ہے اور یہ مدتِ حمل آیاتِ قرآنی سے مستنبط ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

---

[1] وضاحت کے لئے دیکھئے دفعہ نمبر ۱۹ نکاح باطل اور اس کی تشریح۔

وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا۔[1]

یعنی اس کے جنین کی صورت میں اُٹھانے اور اس کے دُودھ چھڑانے پر تیس[۳۰] مہینے لگے تھے۔

ایک اَور جگہ فرمایا:۔

وَفِصٰلُهٗ فِیْ عَامَیْنِ[2]

یعنی اس کا دُودھ چھڑانا دُو سال میں ہوُا۔

گویا باری تعالیٰ نے حمل اور فصال کی مجموعی مدّت تیس[۳۰] ماہ قرار دی ہے اور فصال یعنی دُودھ چھڑانے کی مدّت دو سال۔ اِس طرح حمل کی کم از کم مدّت چھ ماہ ٹھہرتی ہے لہٰذا اگر بچّہ نکاح کے چھ ماہ بعد پیدا ہوُا ہو تو وہ بدوں دعوٰی ثابت النسب ہوگا۔ اس سے کم مدّت میں پیدا ہونے والا بچّہ محض ولادت کی بناء پر ثابت النسب نہیں ہوگا۔

زیادہ سے زیادہ مدّتِ حمل عمومی طور پر اگرچہ ۲۸۰ یوم بنتی ہے مگر امام ابوحنیفہؒ نے اِستثنائی صُورتوں کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اور بچّے کے نسب کو حتی الامکان صحیح ٹھہرانے کے لئے زیادہ سے زیادہ مدّتِ حمل دو سال قرار دی ہے اِس لحاظ سے ان کے نزدیک خاوند کی وفات کے بعد اگر کوئی بیوہ دو سال کی مدّت کے اندر اندر بچّہ جَنے اور دعوٰی کرے کہ یہ اس کے فوت شدہ خاوند کا بچّہ ہے تو قانوناً اسے درست اور ثابت النسب سمجھا جائے گا یعنی وہ بچّہ اس کے فوت شدہ خاوند کا ہوگا لیکن اِس دعوٰی کی بناء پر نہ کہ محض ولادت کی بِناء پر۔

جماعتِ احمدیہ کے نزدیک طبعی مدّتِ حمل کا فیصلہ قانون اور طبعی شواہد کے مطابق ہونا چاہیئے کیونکہ خدا کا قول اس کے فعل کے خلاف نہیں ہوسکتا اِس لئے صحتِ نسب کے لئے قوانینِ طبعی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پس متنازعہ فیہ صورت میں ماہر اطبّاء کی رائے کو اہمیّت دی جائے گی۔[3]

ب:۔ اقرار کی بناء پر ثبوتِ نسب:۔

اگر ولادت ایسے حالات میں ہوئی ہو کہ اس سے نسب متعیّن نہ ہوتا ہو یا اس میں کوئی شُبہ

---

[1] سُورۃ الاحقاف آیت ۱۶ [2] سُورۃ لقمٰن آیت ۱۵

[3] مدّت حمل کی اکثر طبیبوں کے نزدیک ڈھائی برس بلکہ بعض کے نزدیک اِنتہائی مدّت حمل کی تین برس تک بھی ہے۔ (مجموعہ اشتہارات حضرت مسیح موعودؑ جلد اوّل صفحہ ۱۲۸ اشائع کردہ الشرکۃ)

ہو تو اِسلام نے قطعِ نظر ولادت کے مرد کے محض اقرار سے نسب کو درست تسلیم کیا ہے لیکن اِس طرح محض اقرار کے ذریعہ نسب درست ٹھہرانے کے لئے ضروری ہے کہ اقرار کرنے والے اور بچّے کی عمر میں اِتنا تفاوت ضرور ہو کہ مُقر کا باپ ہونا عقلاً محال نہ ہو۔

بعض فقہاء نے یہ لکھا ہے کہ اِقرار کرنے والا کم ازکم ساڑھے بارہ سال اس شخص سے بڑا ہو جس کے باپ ہونے کا وہ اقرار کرتا ہے۔ فقہ احمدیہ میں اس کے لئے ماہ و سال کی تعیین ضروری نہیں البتہ حالاتِ معلومہ کے مطابق مُقر کا باپ ہونا عقلاً محال نہیں ہونا چاہیئے۔ اِسی طرح اقرار ایسا ہونا چاہیئے کہ اس کی وجہ سے ولادت کو صحیح قرار دینا دیگر پہلوؤں کے لحاظ سے ایک حد تک ممکن ہو۔

چنانچہ مندرجہ ذیل صورتیں ایسی ہیں کہ ان میں اقرار کے باوجود نسب ثابت نہیں ہوگا:۔

ا۔ جبکہ بچہ کا ولد الزنا ہونا ثابت ہو چکا ہو۔

ب۔ جن کا دعوٰی ہو وہ دونوں میاں بیوی رہے ہوں اور ان کے درمیان لعان ہو چکا ہو۔

ج۔ اقرار کرنے والے اور مُقرلہٗ کی عمروں میں اتنا تفاوت ہو کہ ان کا آپس میں باپ بیٹا ہونا ممکن نہ ہو۔

د۔ بچّے کا نسب معروف ہو۔

ہ۔ بچّے کی ماں کسی دوسرے شخص کے نکاح میں ہونے کی وجہ سے اقرار کرنے والے کی کسی جہت سے زوجہ نہ بن سکتی ہو۔

و۔ بچہ اس اقرار کی تردید کرتا ہو۔

ز۔ اقرار کرنے والا اس سے قبل کسی شکل میں انکار کر چکا ہو اور اس انکار کی وجہ سے اس کے خلاف فیصلہ ہو چکا ہو۔

مندرجہ بالا صورتوں کے علاوہ باقی صورتوں میں مُقر کا اقرارِ نسب درست سمجھا جائے گا اور اقرار کرنے کے بعد وہ اس نسب سے انکار نہیں کر سکے گا۔

○

دفعہ نمبر ۲۶

اگر نکاح کے بعد اقل مدت حمل سے پہلے بچہ پیدا ہو اور خاوند بچے کا باپ ہونے سے اِنکار کرے تو اس کا نسب ثابت نہیں ہوگا۔

تشریح:۔ دفعہ نمبر ۲۶ تا دفعہ نمبر ۳۱ درحقیقت نسب سے متعلق بعض منفی صُورتیں ہیں۔ چونکہ منفی صُورتوں میں بچے اور اس کی ماں کے حقوق پر اثر پڑتا ہے اِس لئے ان کو الگ بالتصریح بیان کر دیا گیا ہے۔

اقل مدت حمل سے پہلے بچے کی پیدائش کی صورت میں اگر خاوند بچے کا باپ ہونے کا اقرار کرے تو اس اقرار کی بنیاد پر اس کا نسب ثابت ہوگا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

" اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ۔" [1]

یعنی شریعت نے فراش اور نکاح کو اثبات نسب کا مدار قرار دیا ہے۔ فراش سے مراد مرد اور عورت کا وہ تعلقِ ازدواج ہے جس کی شریعت نے اجازت دی ہے یعنی یہ تعلق نکاح کی بُنیاد پر قائم ہوُا ہو تاہم اس صُورت میں اگر خاوند ثبوت نسب سے انکار کرے تو اسے لعان کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا کیونکہ بظاہر حالات اس کا یہ انکار درست معلوم ہوتا ہے۔ درحقیقت عورت کے بطن سے بچے کی پیدائش محسوس اور مشہود ہوتی ہے اِس لئے اگر وہ بچے کی ولادت سے انکار بھی کرے تو اس کا یہ انکار درست تسلیم نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس کا انکار مشاہدہ کے خلاف ہے لیکن باپ کی ابوّت محسوس اور مشہود نہیں ہوتی اِس لئے اس کے انکار کی صورت میں طبعی حالات کو دیکھا جائے گا۔ اگر طبعی حالات اس کے انکار کی تردید نہیں کرتے تو اس کے انکار کو درست تسلیم کر لیا جائے گا اور ایسی صورت میں اسے لعان کرنے یا کوئی اَور قانونی ثبوت پیش کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

---

[1] بخاری کتاب الفرائض باب من ادعٰی اخا او ابن اخ صفحہ ۱۰۰۱/۲۔ ابوداؤد صفحہ ۳۱۰/۱

دفعہ نمبر ۲۷

اگر خاوند قاضی کے سامنے اپنی بیوی پر الزام لگائے کہ اس نے ناجائز بچہ جنا ہے اور بیوی اس الزام کو درست تسلیم کرلے تو مولود کا نسب ثابت نہیں ہوگا۔

تشریح:- چونکہ انکارِ نسب یا انتفاءِ نسب بہت سے حقوق و فرائض پر اثر انداز ہوتا ہے مثلاً وہ دونوں ایک دوسرے کی وراثت سے محروم ہوجاتے ہیں خاوند پر اس بچے کے نان ونفقہ کی ذمہ داریاں ختم ہوجاتی ہیں[1] اس لئے اِس قسم کا ادّعا یا الزام لگانا قاضی کے رُوبرو ضروری ہے تاکہ یہ امر ریکارڈ میں آجائے اور خاوند دیگر قانونی اُلجھنوں سے نجات حاصل کرلے اس الزام اور دعوٰی کو صرف اس صورت میں درست سمجھا جائے گا جبکہ بیوی بھی اس الزام کو درست تسلیم کرے ورنہ خاوند کو لعان پر مجبور کیا جائے گا اور لعان سے انکار کی صورت میں اسے زنا کی تہمت (قذف) کا مجرم قرار دیا جائے گا اور نسب بھی ثابت ہوگا بشرطیکہ دوسری شرائط موجود ہوں۔

○

دفعہ نمبر ۲۸

اگر خاوند اور بیوی قاضی کے سامنے لعان کریں اور ساتھ ہی خاوند انکارِ نسب کرے تو مولود کا نسب ثابت نہ ہوگا۔

تشریح:- جمہور فقہاء کے نزدیک لعان کی تعریف یہ ہے کہ جب خاوند قاضی کے سامنے جاکر اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے تو قاضی کے سامنے خاوند چار مرتبہ اللہ کی قسم کھاکر شہادت دے کہ اس نے

---

[1] سوائے اس کے کہ قاضی سیاستاً خاوند کو بچہ کے نان ونفقہ کا ذمہ دار قرار دے۔

زنا کرتے دیکھا ہے اور اس الزام میں وہ سچا ہے اور پانچویں شہادت یہ دے کہ اگر وہ اپنے دعوٰی میں جھوٹا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔

اس کے بعد اس کی بیوی اگر الزام کی صحت سے انکار کرے تو وہ اللہ کی قسم کھا کر چار مرتبہ یہ کہے کہ اس کا خاوند یہ الزام لگانے میں جھوٹا ہے اور پانچویں قسم اِس طرح کھائے کہ اگر اس کا خاوند سچا ہے تو خدا کا غضب اس پر (یعنی مجھ پر) نازل ہو۔

لعان کا ثبوت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتا ہے :۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ٥ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ٥ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۙ٥ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ٥ [1]

یعنی جو لوگ اپنی بیویوں پر زنا کا اِلزام لگاتے ہیں اور ان کے پاس سوائے اپنے وجود کے اَور کوئی گواہ نہ ہو تو ان میں سے ہر شخص کو ایسی گواہی دینی چاہیئے جو اللہ کی قسم کھا کر چار گواہیوں پر مشتمل ہو اور ہر گواہی میں وہ یہ کہے کہ وہ راستبازوں میں سے ہے اور پانچویں گواہی میں کہے کہ اس پر خدا کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو۔ اور وہ بیوی جس پر اس کا خاوند الزام لگائے اپنے نفس پر سے چار ایسی گواہیوں کے ذریعے سے جو قسم کھا کر دی گئی ہوں عذاب دُور کرے۔ یہ کہتے ہوئے کہ وہ خاوند جھوٹا ہے۔ اور پانچویں قسم اِس طرح کھائے کہ اللہ کا غضب اس عورت پر نازل ہو اگر وہ اِلزام لگانے والا خاوند سچا ہے۔

لعان کا حکم درحقیقت خاوند اور بیوی ہر دو کے لئے شریعت کی طرف سے بہت بڑا اِحسان ہے بلکہ اس کے ذریعہ سے خاوند حد "قذف" سے بچ جاتا ہے اور بیوی حد "زنا" سے۔[2]

لعان کے بعد فریقین کے درمیان تفریق لازم ہے کیونکہ اس تفریق کی وجہ سے فریقین ایکدوسرے

---

[1] سُورۃ النور آیت ۷ تا ۱۰

[2] رائج الوقت قانون کے تحت اِس وقت یہ حدیں نافذ العمل نہیں۔

کے خلاف بُغض و عناد کی آگ سے محفوظ ہو جاتے ہیں اور خاوند بچّے کے نان و نفقہ کی ذمّہ داریوں سے آزاد ہو جاتا ہے[1]

اگر خاوند کی طرف سے صرف زنا کا الزام ہو تو لعان کے بعد دونوں کے درمیان تفریق واجب ہے لیکن اگر زنا کے اِلزام کے علاوہ بچّے کے نسب کی نفی کا دعوٰی بھی شامل ہو تو اس صورت میں لعان کے بعد خاوند سے مولود کا نسب ثابت نہ ہو گا جیسا کہ ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال ابنِ اُمیّہ اور اس کی بیوی کے درمیان لعان کے بعد بچّے کی نسب صرف اس کی ماں کے ساتھ منسلک کر دی تھی۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں :-

لَاعَنَ بَيْنَ الرَّجُلِ وَامْرَأَتِهٖ فَانْتَفٰى مِنْ وَّلَدِهَا فَفَرَّقَ بَيْنَهُمَا وَأَلْحَقَ الْوَلَدَ بِالْمَرْأَةِ ۔[2]

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرد اور عورت کے درمیان لعان کروایا اور مرد نے اس لڑکے کی نفی کا بھی دعوٰی کیا۔ اِس بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں میں تفریق کرا دی اور بچّہ عورت کے ساتھ ملحق کر دیا۔

لیکن یہ نفیٔ ولادت صرف اس صورت میں مؤثر ہو گی جب کہ نفی کرنے والا اس سے پہلے کسی وقت صراحتًا یا کنایۃً اقرارِ نسب نہ کر چکا ہو۔ اقرارِ نسب کے بعد انکار درحقیقت ایک مسلّمہ حقیقت سے انکار ہے جو شرعًا اور قانونًا جائز نہیں ہے۔

کنایۃً اقرارِ نسب سے مراد یہ ہے کہ مثلاً وہ ایک وقت تک بچّے کے نان و نفقہ کی ذمّہ داری خاموشی سے برداشت کرتا رہا ہو یا بیوی اور دیگر عزیز و اقارب کی طرف سے اس بچّے کا نسب اپنی طرف منسوب ہوتے ہوئے سُنتا رہا ہو اور کسی مرحلہ پر اس نے انکار یا انحراف نہ کیا ہو تو ان سب صورتوں میں اس کی طرف سے نفی ولادت مؤثر نہ ہو گی اور نہ وہ بچّے کے نان و نفقہ کی ذمّہ داریوں سے بَری ہو گا۔

○

---

[1] سوائے اِس کے کہ دینی مصلحت کا تقاضا ہو کہ لعان کے باوجود خاوند بچّے کے نان و نفقہ کا ذمّہ دار ہے۔

[2] بخاری کتاب الطلاق باب یلحق الولد بالملاعنة جلد ۲ صفحہ ۸۰۱

دفعہ نمبر ۲۹

اگر کوئی شخص اِس بناء پر کسی بچّے کا باپ ہونے سے اِنکار کرے کہ بیوی سے عدم مقاربت کی وجہ سے یا دیگر وجوہات کی بناء پر عقلاً وطبعاً وہ بچہ اس کا نہیں ہوسکتا تو باپ کا یہ دعوٰی ثابت ہونے پر بچّے کے نسب کی نفی ہو جائے گی۔

تشریح:- زیادہ سے زیادہ مدتِ حمل جیسا کہ دفعہ نمبر ۲۳ تشریح الف کے تحت بیان کیا جاچکا ہے قانون شرعی اور طبعی شواہد یعنی ماہر اطبّاء کی رائے کے مطابق قرار پائے گی۔ اگر ان شواہد کے مطابق خاوند اپنی بیوی سے اتنا عرصہ الگ رہا ہو کہ بچہ کا اس کے نسب سے ہونا بظاہر حالات ممکن نہ ہو تو اس صورت میں خاوند کے لئے لعان لازم نہیں ہوگا اور نسب کی نفی کے لئے صرف "الگ رہنے" کا ثبوت پیش کرنا کافی ہوگا۔

○

دفعہ نمبر ۳۰

پرورش کی بناء پر کوئی شخص لقیط کا ولی نہیں بن سکتا اور نہ ہی لقیط اور پرورش کنندہ ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں۔

تشریح:- لقیط اس لاوارث بچّے کو کہا جاتا ہے جو کسی عام جگہ پڑا ہوا کسی کو مل جائے اور وہ اسے اُٹھالے اور اس کی پرورش کی ذمّہ داری قبول کرلے۔ ایسا لاوارث بچہ جس کی پرورش کی ذِمّہ داری کوئی شخص قبول نہ کرے اس کی پرورش کی ذمّہ داری حکومت اور بیت المال پر ہوگی۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اس قسم کا ایک بچہ پڑا ہؤا ملا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس بچے کی پرورش کا خرچ بیت المال سے ادا ہوگا۔

اسی طرح حضرت علیؓ نے بھی ایسے بچے کے لئے یہی فیصلہ فرمایا۔[1]

ہدایۃ میں ہے کہ اگر ایک شخص کسی بچے کو پڑا پائے اور اس کی پرورش قبول کرے تو کسی دوسرے شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اس کی مرضی کے بغیر اس سے وہ بچہ لے لے، لیکن اگر دوسرا شخص اس بچے کے نسب کا دعوٰی کرے اور کوئی اَور شخص اس کے نسب کا مدّعی نہ ہو اور حالات کے لحاظ سے یہ دعوٰی درست لگتا ہو اور قرائن اس کی تائید کرتے ہوں تو اس کے دعوٰی کو درست تسلیم کیا جائے گا۔

صاحب ہدایہ کے نزدیک یہ دعوٰی اِستحساناً صحیح ہوگا کیونکہ اس دعوٰی کی بناء پر

ا۔ بچے کو شفقتِ پدری حاصل ہوگی۔

ب۔ اسے نسب کا شرف حاصل ہو جائے گا جس سے وہ پہلے محروم تھا۔

ج۔ اور وہ ولد الزّنا کی تہمت سے محفوظ ہو جائے گا۔

یہ سب امور بچے کے فائدہ کے لئے ہیں اِس لئے اس دعوٰی کو درست تسلیم کیا جائے گا۔[2]

دعوٰئ نسب کے بغیر محض پرورش کی بناء پر پرورش کنندہ اور لقیط ایک دوسرے کے وارث نہ ہونگے بعض اَوقات بے اولاد لوگ جو بچے ہسپتالوں یا رفاہی اداروں سے حاصل کر لیتے ہیں یا قدرتی آفات وغیرہ کے نتیجہ میں جو بچے اپنے والدین سے بچھڑ جاتے ہیں اور کوئی ان کو لے کر پال لیتا ہے یہ سب لقیط کے حکم میں ہوں گے۔

○

[1] مؤطا امام مالك كتاب الاقضيه باب القضاء في المنبوذ ص۳۰۹ و نصب الرايه جلد ۳ ص۴۶۵

[2] هدايه كتاب اللقيط جلد ۲ ص۵۷۶۔

دفعہ نمبر ۱۳

متبنّٰی اور متبنّٰی بنانے والا قانوناً اور شرعاً ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوتے۔

تشریح:- اِسلام سے قبل متبنّٰی بنانے کا رواج عام تھا اور اسے حقیقی بیٹے کی طرح جائیداد کا وارث قرار دیا جاتا تھا لیکن اِسلامی احکامِ وراثت کے نزول کے بعد ہر قسم کے مُنہ بولے بیٹے یا دینی بھائی وراثت کے حقدار نہ رہے۔

ہجرت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے درمیان "مواخات" یعنی بھائی چارہ کا تعلق قائم فرمایا تھا اور شروع شروع میں وہ وراثت میں بھی ایک دوسرے کے حقدار بن جاتے تھے لیکن احکامِ وراثت کے نزول کے بعد سے کوئی مُنہ بولا بھائی یا کوئی مُنہ بولا بیٹا شرعی وارثوں کی طرح وارث نہ رہا۔

اِسلام سے قبل مُنہ بولے بیٹے کے ساتھ صہری رشتے بھی اسی طرح حرام سمجھے جاتے تھے جیسے حقیقی بیٹے کے ساتھ۔ مثلاً بیٹا بنانے والا متبنّٰی کی بیوی سے (طلاق یا بیوگی کی صورت میں) نکاح نہیں کر سکتا تھا لیکن اسلام نے ایسے رواج کو بھی منسوخ فرما دیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:-

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝[1]

یعنی جب زید نے اس عورت کے بارہ میں اپنی خواہش پوری کر لی اور اسے طلاق دے دی تو ہم نے اس عورت کا تجھ سے بیاہ کر دیا تاکہ مومنوں کے دلوں میں اپنے لے پالکوں کی بیویوں سے نکاح کرنے کے متعلق ان کو طلاق مِل جانے کی صورت میں کوئی خلش نہ رہے اور خدا کا فیصلہ بہر حال پورا ہو کر رہنا ہے۔

○

---

[1] سورۃ الاحزاب آیت ۳۸

بابُ الطّلاق

بعض مذاہب میں نکاح لازمی طور پر عمر بھر کا بندھن ہوتا ہے اور کسی حالت میں بھی اسے ختم نہیں کیا جا سکتا خواہ اس کا قائم رہنا فریقین کے لئے کتنی بھی شدید ذہنی اور جسمانی اذیّت کا باعث ہو لیکن اِسلام ایسی سختی کا روادار نہیں جو تقاضۂ فطرت کے منافی ہو۔ اِسلام میں نکاح کو اس کی بعض معاشرتی خصوصیات کی وجہ سے اگرچہ شرعی اور دینی تقدّس حاصل ہے لیکن اصلاً چونکہ یہ ایک عمرانی معاہدہ ہے اور فریقین کی یکساں رضامندی سے عمل میں آتا ہے نیز فقہائے اِسلام نے عبادات اور معاملات دونوں سے اس کا تعلق مانا ہے اِس لئے اگر فریقین اس معاہدہ کو نبھانے کے قابل نہ رہیں یا آپس میں نباہ نہ کر سکیں اور وہ اس معاہدہ کو ختم کرنے پر مجبور ہو جائیں تو باوجود اس کے دینی تقدّس کے شریعت نے اس معاہدۂ نکاح کو ختم کرنے کی اجازت دی ہے کیونکہ اِسلام نے اِنسانی فطرت کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا اور حتّی الوسع اِنسان کو ایسے حالات سے بچانے کی کوشش کی ہے جو اس کے لئے ذہنی یا جسمانی اذیّت کا باعث بنیں۔

دوسری طرف چونکہ اس معاہدہ کو دینی تقدّس بھی حاصل ہے اِس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس معاہدہ کو ختم کرنے کو "اَبْغَضُ الْحَلَالِ" کہا ہے اور اس میں جلد بازی سے منع کیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ نکاح حتی الامکان برقرار رہے اور صرف اسی صورت میں یہ تعلق ختم ہو جب حقیقتاً اس کے بغیر کوئی چارہ نظر نہ آئے۔

قرآن کریم اور احادیث کی روشنی میں میاں بیوی کی علیحدگی سے قبل اِصلاح کی کوشش کی غرض سے مندرجہ ذیل تدابیر اختیار کرنے کی ہدایت ہے۔

۱۔ نشوز اور اس کی اِصلاحی تدابیر

نشوز علیحدگی کا پیش خیمہ ہے اِس بارہ میں اِصلاحی تدابیر کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:۔

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاھْجُرُوْھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْھِنَّ سَبِیْلًا ؕ [1]

یعنی جن کی نافرمانی کا تمہیں خوف ہو تم انہیں نصیحت کرو اور انہیں خوابگاہوں میں اکیلا چھوڑ دو اور انہیں مارو پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنے لگیں تو ان کے خلاف کوئی بہانہ تلاش نہ کرو۔

اِس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ نشوز کے تین درجے ہیں۔ چنانچہ امام راغبؒ فرماتے ہیں:۔

نُشُوْزُ الْمَرْاَۃِ بُغْضُھَا زَوْجَھَا وَرَفْعُ نَفْسِھَا عَنْ طَاعَتِہٖ وَعَیْنِھَا عَنْہُ اِلٰی غَیْرِہٖ۔ [2]

یعنی عورت کا نشوز یہ ہے کہ وہ اپنے خاوند سے بُغض رکھے اور اپنے آپ کو اس کی اطاعت سے بالا سمجھے اور اپنی آنکھیں دوسرے مرد کی طرف اُٹھائے۔

نشوز کے ان مختلف درجات کے لحاظ سے آیت کریمہ میں یہ ہدایت ہے کہ

ا۔ نشوز کی پہلی صورت میں عورت کو حکمت کے ساتھ سمجھایا جائے۔

ب۔ نشوز کی دوسری صورت میں ناراضگی کے طور پر اس سے کچھ مدت کے لئے ازدواجی تعلقات منقطع کر لئے جائیں۔

ج۔ اگر ان ذرائع سے اِصلاح نہ ہو اور نشوز کی تیسری صُورت کا سامنا ہو تو مرد کو اجازت ہے کہ وہ بیوی کی مناسب جسمانی تادیب کرے۔

۲۔ تحکیم

اِصلاح کی اِن مذکورہ بالا تدابیر کے ناکام ہونے کی صُورت میں مرد اور عورت دونوں کے خاندانوں میں سے ایک ایک صاحبِ فہم وعدل نمائندہ مقرر کیا جائے یہ دونوں حالات کا جائزہ لینے کے بعد وجۂ فساد دُور کرنے کی کوشش کریں چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِھِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَھْلِہٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَھْلِھَا ۚ

---

[1] سورۃ النسآء آیت ۳۵

[2] المفردات للراغب زیر لفظ نشوز

اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَہُمَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا خَبِیْرًا ۝ [1]

یعنی اگر تمہیں ان دونوں میاں بیوی کے آپس کے تعلقات میں تفرقہ کا خوف ہو تو ایک نمائندہ اس مرد کے رشتہ داروں سے اور ایک نمائندہ اس عورت کے رشتہ داروں سے مقرر کرو۔ پھر اگر وہ دونوں پنچ صلح کرانا چاہیں تو اللہ تعالیٰ ان دونوں میاں بیوی کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا۔ اللہ یقیناً بہت جاننے والا اور خبردار ہے۔

پس اگر اِس ذریعہ کو استعمال کرنے کے باوجود مصالحت نہ ہوسکے تو "اَبْغَضُ الْحَلَال" ہونے کے باوجود بامرِمجبوری اِسلام نے میاں بیوی کو بذریعہ طلاق یا خلع علیحدگی اختیار کرنے کی اجازت دی ہے۔

○

دفعہ نمبر ۳۲

تعلق نکاح جب مرد کی طرف سے ختم کیا جائے تو اسے طلاق اور جب عورت کی طرف سے ختم کرنے کا مطالبہ ہو تو اسے خلع کہتے ہیں۔

تشریح:- طلاق کے لفظی معنی " ازالۃ القید" کے ہیں یعنی قید سے رہائی اور آزادی دینا اور اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ مرد کی طرف سے تعلقِ نکاح کو ختم کیا جائے اور وہ زبانی یا تحریری طور پر یہ کہہ کر کہ مَیں تجھے طلاق دیتا ہوں عورت کو اُس پابندی سے آزاد کر دے جو معاہدہ نکاح کے ذریعہ اس پر عائد ہوئی تھی۔ طلاق دیتے وقت خاوند کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ طلاق کی کوئی وجہ بیان کرے۔ شریعت نے وجہ بیان نہ کرنے کی جو آزادی دی ہے اس میں عظیم مصلحتیں ہیں کیونکہ شارع کا منشاء یہ ہے کہ

---

[1] سورۃ النسآء آیت ۳۶

طلاق اگر ناگزیر ہی ہو جائے تو ناچاقی کی وجوہات کو منظرِ عام پہ لائے بغیر ہی طلاق دی جاوے تاکہ عورت کے مزعومہ نقائص یا کمزوریوں کا چرچہ نہ ہو۔

○

دفعہ نمبر ۳۲

صحتِ طلاق اور اس کے مؤثر ہونے کے لئے مندرجہ ذیل تین شرائط ہیں

ا۔ طلاق ہوش و حواس کی حالت میں پوری سوچ بچار کے بعد اپنی مرضی سے دی جائے۔ جلد بازی، غصہ اور جبر کے تحت دی گئی طلاق مؤثر نہ ہو گی[1]

ب۔ طلاق ایسے طہر میں دی جائے جس میں خاوند نے اپنی بیوی سے مباشرت نہ کی ہو حیض کی حالت میں دی گئی طلاق مؤثر نہ ہو گی۔

ج۔ زبانی یا تحریری طلاق کی اطلاع بیوی کو مل جائے۔ قضاً طلاق کا عمل اس وقت سے شروع ہوگا جب بیوی کو اس کی اطلاع ملی ہو اور اسی وقت سے عورت کی عدت شروع ہو گی[2]

○

[1،2] بعض فقہاء نے غصہ، جلد بازی اور جبر کی طلاق کو مؤثر مانا ہے۔
اسی طرح یہ بھی ضروری قرار نہیں دیا کہ طلاق کی اطلاع بیوی کو دی جائے لیکن فقہ احمدیہ فقہاء کی اس رائے کو درست تسلیم نہیں کرتی۔ تفصیل کے لئے دیکھیں بدایۃ المجتھد ص ۶۶/۲۔
کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ص ۲۸۴/۴۔

دفعہ نمبر ۳۴

طلاق کا ثبوت یا تو میاں بیوی دونوں کے اقرار سے ہوگا یا گواہوں کی گواہی سے۔ مستند تحریر بھی گواہی کے قائمقام سمجھی جا سکتی ہے۔

دفعہ نمبر ۳۵

قابلِ رجوع یا قطعی ہونے کے لحاظ سے طلاق کے تین درجے ہیں۔
ا۔ طلاق رجعی ——— ب۔ طلاق بائن ——— ج۔ طلاق بتہ

تشریح:۔ جیسا کہ پہلے وضاحت آچکی ہے کہ طلاق "اَبْغَضُ الْحَلَال"[1] ہونے کی وجہ سے ایک اِنتہائی ناپسندیدہ فعل اور ایک ناگزیر بُرائی ہے اِس لئے اس منزل تک پہنچنے سے پہلے اِنتہائی سوچ بچار کر لینا ضروری ہے اِسی لئے شریعت نے تحکیم کی ہدایت کی ہے اور تحکیم کے بعد اگر علیحدگی ضروری ٹھہرے تو بھی اِس نازک تعلق کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے سے پہلے مرد کو بار بار سوچ بچار کرنے کے مواقع مہیا کئے ہیں اور اِسی لئے الگ الگ وقتوں میں تین طلاق دینے کی رعایت خاوند کو دی گئی ہے۔

طلاقِ رجعی

طلاقِ رجعی وہ طلاق ہے جس میں عدت[2] کے دَوران خاوند رجوع کر سکتا ہے مثلاً ایسے ایام میں

---

[1] ابوداؤد کتاب الطلاق باب فی کراھیۃ الطلاق ص۱۹۶
[2] عدت کی تفصیل کے لئے دیکھیں دفعہ نمبر ۴۳۔

جب کہ عورت حالتِ طہر میں ہو مرد صرف ایک طلاق دے۔ اِس طلاق کے بعد خاوند عدّت کے اندر بغیر کسی زائد شرط کے رجوع کر سکتا ہے یعنی اس طلاق کو واپس لے سکتا ہے اور عورت کو حسبِ سابق اپنی بیوی کے طور پر رکھ سکتا ہے۔

طلاق بائن

طلاق بائن وہ طلاق ہے جس میں خاوند رجوع تو نہیں کر سکتا البتہ عدّت کے دَوران یا عدّت کے بعد بیوی کی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر سکتا ہے۔ مثلاً نکاح کے بعد قبل از رخصتانہ و خلوتِ صحیحہ طلاق دے یا بیوی کی طرف سے مالی معاوضہ لے کر اسے طلاق دے یا طلاق رجعی کے بعد عدّت گذر جائے تو طلاق کی ان سب صورتوں کو طلاق بائن کہتے ہیں۔

طلاق بتّہ

طلاق بتّہ وہ طلاق ہے جس میں نہ رجوع ہو سکتا ہے نہ دوبارہ نکاح جائز ہے گویا یہ طلاق فریقین کے درمیان قطعی تفریق کا باعث بن جاتی ہے اور ایسی ہی طلاق پر "حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ" کی پابندی عائد ہوتی ہے۔

تشریح

طلاق کی ان تینوں قسموں کی تشریح علی الترتیب درج ذیل ہے:۔

ا۔ طلاق رجعی :۔ طلاق کے حق کو استعمال کرنے کے بارہ میں اِسلام کی اصولی ہدایت یہ ہے کہ مرد عورت کے طہر کے ایّام میں صرف ایک طلاق دے اس کے نتیجہ میں تین قروء یعنی تین حیض عدّت گزرنے کے دَوران اگر خاوند چاہے تو وہ بغیر کسی شرعی روک کے رجوع کر سکتا ہے[1] اور عدّت گزرنے کے بعد گو علیحدگی مکمّل ہو جائے گی، لیکن اگر یہ دونوں چاہیں تو باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔

اِس طرح طلاق دے کر اس کے بعد عدّت کے اندر رجوع کرنے کا حق آیاتِ قرآنی کی روشنی

---

[1] وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا (سورۃ البقرہ آیت ۲۲۹)

ہیں دو مرتبہ ہے[1]

غرض جن حالات میں طلاق دے کر رجوع کرنے کا حق باقی رہے ان حالات میں دی گئی طلاق کو فقہ کی اصطلاح میں "طلاق رجعی" کہتے ہیں۔

طلاق رجعی کے بعد عدّت کے دَوران میں خاوند کو یہ حق ہے کہ وہ طلاق واپس لے لے جیسا کہ فرمایا:۔

وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا۔[2]

اِس لحاظ سے مرد کا یک طرفہ طور پر طلاق واپس لے لینا ہی رجوع کے لئے کافی ہے کیونکہ ابھی سابقہ نکاح قائم ہے اور بکلّی اِنقطاع نہیں ہوُا۔ رجعی طلاق گویا ایک معلّق طلاق ہے۔ عدّت کے دَوران اسے واپس لیا جا سکتا ہے، لیکن عدّت گزرنے کے بعد "یہی طلاق" بائن ہو جائے گی۔

ب۔ طلاق بائن:۔ وہ طلاق ہے جس کے نتیجہ میں طلاق واقع ہو جاتی ہے اور خاوند کو عدّت کے اندر رجوع کا حق باقی نہیں رہتا البتہ باہمی رضامندی سے عدّت کے دَوران اور عدّت گزرنے کے بعد دونوں صورتوں میں دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔ مثلاً قبل از رخصتانہ یعنی مباشرت کا موقع ملنے سے پہلے طلاق دینا "بائن طلاق" کے حکم میں ہے۔ فقہاء نے خلع، مبارات[3] اور فسخ نکاح کو بھی طلاق بائن کے حکم میں رکھا ہے[4]۔ اِسی طرح رجعی طلاق عدّت گذرنے کے بعد طلاق بائن بن جاتی ہے اِس قسم کی طلاق کے بعد نیا نکاح ہو سکتا ہے۔

ج۔ طلاق بتّہ:۔ احکامِ قرآنی کے مطابق نکاح کے نتیجہ میں مرد کو تین طلاق کا حق ملتا ہے۔ یہ حق کس طرح اِستعمال کیا جا سکتا ہے۔ اِس بارہ میں فقہاء کے تین مَسلک ہیں:۔

۱۔ ایک مَسلک یہ ہے کہ مرد کو اختیار ہے کہ وہ یہ حق جس طرح چاہے اِستعمال کرے چاہے تو بیک وقت یہ کہہ کر اپنا حق اِستعمال کر لے کہ "تجھے تین طلاق" یا تجھے طلاق، تجھے طلاق، تجھے طلاق۔ یا وقفہ وقفہ کے بعد الگ الگ اَوقات میں تین بار یہ حق استعمال کرے ہر طرح اسے اختیار ہے۔

---

[1] اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (سورۃ البقرہ آیت ۲۳۰)

[2] سورۃ البقرہ آیت ۲۲۹۔

[3] مبارات: اظہارِ برأت، بے زاری کا اظہار

[4] تفصیل کے لئے دیکھیں دفعہ نمبر ۴۴

۲۔ دوسرا مَسلک یہ ہے کہ مرد یہ حق تین الگ الگ طہروں میں اِستعمال کر سکتا ہے مثلاً پہلے طہر میں پہلی طلاق دے، دوسرے طہر میں دوسری اور تیسرے طہر میں تیسری۔ اِس طرح تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی اور دونوں (مرد اور عورت) میں دائمی فرقت ہو جائے گی۔

۳۔ تیسرا مَسلک یہ ہے کہ مرد اپنا یہ حق اِستعمال کرنے میں آزاد نہیں بلکہ وہ بعض مخصوص شرائط[1] کے تحت ہی یہ حق اِستعمال کر سکتا ہے۔ اِس اختلاف کے باوجود تمام علماء اُمّت کے نزدیک اِسلام یہ پسند کرتا ہے اور اسے ترجیح دیتا ہے کہ خاوند کو تین طلاق دینے کا جو حق دیا گیا ہے وہ اسے بڑی احتیاط کے ساتھ استعمال کرے یعنی صرف ایک طلاق دے۔ اِس کا فائدہ یہ ہوگا کہ عدّت کے اندر وہ رجوع کر سکے گا اور عدّت کے بعد باہمی رضامندی سے ان کا دوبارہ نکاح ہو سکے گا۔ مرد کے طلاق دینے اور اس سے رجوع کرنے کے مسئلے پر پیش آنے والی مختلف صورتوں کو سامنے رکھ کر فقہاء نے مختلف فتوے دیئے ہیں۔ بعض فقہاء نے مرد کے رجوع کے حق کو زیادہ پابند کیا ہے اور بعض فقہاء نے اِس بارہ میں سہولت کو مدِّنظر رکھا ہے تاکہ میاں بیوی کا تعلق جو ظہور میں آ چکا ہے اسے حتّی الامکان قائم رکھا جائے۔

فِقہ احمدیہ نے سہولت کے طریقِ کار کو ترجیح دی ہے۔ فقہ احمدیہ کی رُو سے ہر ممکن کوشش اِس امر کی ہونی چاہیئے کہ فریقین اگر مائل بہ اِصلاح ہوں اور وہ نکاح کو قائم رکھ سکیں تو اس سِلسلہ میں شریعت کے اصل منشاء کو پیشِ نظر رکھا جائے جو یہ ہے کہ زوجین کے تعلق کو قطعی طور پر ختم کرنے سے پہلے ہر ممکن موقع رجوع کا دیا جائے۔

جماعتِ احمدیہ کا یہ مَسلک قرآن وحدیث کے مختلف احکام کے عین مطابق ہے اور اس مَسلک کی سَند فقہائے سَلف سے بھی ملتی ہے۔

حقِ طلاق کے اِستعمال پر پابندی کی ایک مثال یہ ہے کہ کوئی شخص تین طلاق کا حق ایک ہی دفعہ اِستعمال کرے۔ فقہائے حنفی کے نزدیک اگر اِس طرح ایک ہی نشست میں تین طلاقیں دے دی جائیں تو تینوں واقع ہو جاتی ہیں گویا طلاق بتہ یعنی قطعی طلاق وقوع میں آ جاتی ہے اور مرد کو رجوع یا دوبارہ نکاح کا حق حاصل نہیں رہتا۔

لیکن فِقہ احمدیہ اِس طرح ایک نشست میں تین طلاق کے اِستعمال اور اس کے اس اثر کو تسلیم نہیں کرتی اور اِس بات پر زور دیتی ہے کہ جس بات کو شریعت نے "تین بار" پر موقوف کیا ہے وہ تین

---

[1] اِن مخصوص شرائط کی تفصیل آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرماویں۔

مختلف اوقات میں ہی ہونی چاہیئے کیونکہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ [۱]

یعنی ایسی طلاق جس میں رجوع ہوسکے دو دفعہ ہوسکتی ہے پھر یا تو مناسب طور پر روک لینا ہوگا یا حُسنِ سلوک کے ساتھ تیسری طلاق دے کر رخصت کر دینا ہوگا۔

ا۔ اِس آیت سے پہلے ارشادِ باری ہے:۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ [۲] یعنی جن عورتوں کو طلاق مِل جائے وہ تین بار حیض آنے تک اپنے آپ کو روک رکھیں جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آیت "اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ" میں "اَلطَّلَاقُ" سے اشارہ اسی اَلْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ کی طرف ہے اور مطلب یہ ہے کہ ایک ایسی عورت جس کو ایک طلاق دی گئی ہو اور وہ عدّت گذار رہی ہو خاوند کو حق ہے کہ وہ عدّت (تین قروء یا تین ماہ) کے اندر رجوع کرلے اور اگر عدّت گذر جائے تو باہمی رضامندی سے نیا نکاح کرلے۔ اس رجوع یا دوسرے نکاح کے بعد اگر وہ پھر طلاق دے دے تو خاوند کو ایک بار پھر عدّت کے اندر رجوع کرنے اور عدّت گذرنے کے بعد باہمی رضامندی سے نیا نکاح کرنے کا حق ہوگا اِس دوسرے رجوع یا تیسرے نکاح کے بعد اگر وہ پھر طلاق دے گا تو اس تیسری طلاق کے بعد عدّت کے اندر نہ وہ رجوع کرسکے گا اور نہ عدّت کے بعد باہمی رضامندی سے نیا نکاح کرسکے گا جب تک کہ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ [۳] کی شرط پوری نہ ہو۔ آیتِ کریمہ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ میں اسی انداز سے دی ہوئی تین طلاقوں کا ذکر ہے۔

ب۔ آیت میں "مَرَّتٰنِ" کا لفظ دو الگ الگ موقعوں پر طلاق دینے کا متقاضی ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ الگ الگ مواقع کون سے ہیں۔ یہی مقام قابلِ غور ہے۔

صاحب نیل الاوطار لکھتے ہیں:۔

اَلظَّاهِرُ اَنَّ الطَّلَاقَ الْمَشْرُوْعَ لَا يَكُوْنُ بِالثَّلَاثِ دَفْعَةً بَلْ عَلَى التَّرْتِيْبِ الْمَذْكُوْرِ وَهٰذَا اَظْهَرُ۔ [۴]

---

[۱] سورۃ البقرہ آیت ۲۳۰۔ [۲] سورۃ البقرہ آیت ۲۲۹

[۳] سورۃ البقرہ آیت ۲۳۱

[۴] نیل الاوطار کتاب الطلاق باب ماجاء فی طلاق البتۃ الخ ص ۲۳۲/۶

یعنی مسئلۂ طلاق کے بارہ میں جو احادیث مروی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ہی دفعہ تین طلاقیں دینے سے تین طلاقیں نہیں پڑتیں بلکہ قرآن و حدیث میں مذکور ترتیب کے مطابق طلاق دینے کی ہدایت کی پابندی ضروری ہے اور یہی مسلک زیادہ واضح اور صحیح ہے۔

گویا احکامِ قرآنی اور ارشاداتِ نبویؐ کے مطابق اکٹھی تین طلاقیں دینا مشروع نہیں ہے لہٰذا فقہ احمدیہ کے نزدیک اگر تین طلاقیں ایک دفعہ ہی دے دی جائیں تو ایک رجعی طلاق متصوّر ہوگی۔

ایک صحابی حضرت رکانہؓ نے ایک مجلس میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں جس کا اسے بعد میں احساس ہوا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ معاملہ پہنچا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ اس نے طلاق کس طرح دی تھی۔ اس نے بتایا کہ ایک ہی مجلس میں اس نے تین طلاقیں دے دی تھیں اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس طرح تو ایک طلاق واقع ہوتی ہے تم رجوع کر لو[1]

یہ بات مستند روایات سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے سارے عہدِ خلافت اور حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت کے ابتدائی دَور میں ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں ایک طلاق متصوّر ہوتی تھیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے جب یہ محسوس فرمایا کہ شریعت کی دی گئی ایک سہولت کو بعض نادان لوگوں نے مذاق بنا لیا ہے تو یہ حکم صادر فرمایا کہ لوگوں کی اس جلد بازی پر گرفت کی جائے اور اس طرح کی دی ہوئی تین طلاقوں کو تین ہی متصوّر کیا جائے تاکہ لوگوں کو تنبیہہ ہو[2]

مگر حضرت عمرؓ کا یہ حکم تعزیر کا رنگ رکھتا ہے اور اسے دائمی حکم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں جن فقہاء نے ایک نشست میں تین طلاقوں کو تین تسلیم کیا ہے وہ بھی ایسی طلاق کو "طلاق بدعت" کا نام دیتے ہیں گویا اس کا ناپسندیدہ ہونا ان کے نزدیک بھی مسلّم ہے۔ پس فقہ احمدیہ اس بدعت کو شرعی حیثیت نہیں دیتی ہے کہ ایک نشست میں اِس طرح دی گئی تین طلاقوں کے بعد اگر کوئی شخص پشیمان ہو اور رجوع کرنا چاہے تو اس کے رجوع کے حق کو تسلیم کیا جائے گا۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

" اگر تین طلاق ایک ہی وقت میں دی گئی ہوں تو اس خاوند کو یہ فائدہ دیا گیا ہے کہ وہ عدّت کے گذرنے کے بعد بھی اس عورت سے نکاح کر سکتا ہے کیونکہ یہ طلاق ناجائز

---

[1] مسند احمد ص۲۶۵/۱ - دارقطنی ص۴۳۸/۲ - نبیل الاوطار ص۲۲۶/۶

[2] صحیح مسلم مصری کتاب الطلاق باب طلاق الثلاث ص۶۷۲

طلاق تھا اور اللہ و رسول کے فرمان کے موافق نہ دیا گیا تھا۔ دراصل قرآن شریف میں غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو یہ امر نہایت ہی ناگوار ہے کہ پُرانے تعلقات والے خاوند اور بیوی آپس کے تعلقات کو چھوڑ کر الگ الگ ہو جائیں یہی وجہ ہے کہ اس نے طلاق کے واسطے بڑے بڑے شرائط لگائے ہیں۔ وقفہ کے بعد تین طلاق کا دینا اور ان کا ایک ہی جگہ رہنا وغیرہ یہ امور سب اس واسطے ہیں کہ شاید کسی وقت ان کے دِلی رنج دُور ہو کر آپس میں صلح ہو جاوے..... خدا تعالیٰ فرماتا ہے " اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ" یعنی دو دفعہ کی طلاق ہونے کے بعد یا اسے اچھی طرح سے رکھ لیا جاوے یا احسان سے جُدا کر دیا جاوے۔ اگر اتنے لمبے عرصے میں انکی آپس میں صلح نہیں ہوتی تو پھر ممکن نہیں کہ وہ اِصلاح پذیر ہیں۔"[1]

بہرحال فقہ احمدیہ کے نزدیک تین طلاقوں کا حق یا تو دو رجعی اور ایک بائن طلاق کی صُورت میں استعمال ہو گا یا تین بائن طلاقوں کی صورت میں جس کی شکل یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو ایک طلاق رجعی دے پھر عدّت کے دَوران رجوع کرے تو وہ ایک طلاق واقع ہو جائے گی اس کے بعد اگر وہ دوبارہ طلاق رجعی دے اور پھر عدّت کے اندر رجوع کرے تو یہ اس کی طرف سے دوسری طلاق واقع شدہ شمار ہو جائے گی۔ اب اس کے بعد جب تیسری مرتبہ طلاق دے گا تو وہ " طلاق بتّہ" ہو گی یعنی عدّت کے اندر رجوع کرنے اور عدّت کے بعد نکاح کرنے کا حق باقی نہیں رہے گا کیونکہ وہ اپنا طلاق دینے کا حق تین مرتبہ اِستعمال کر چکا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق رجعی دے اور عدّت کے دَوران رجوع نہ کرے اس صورت میں عدت گزرنے کے بعد ایک "طلاق بائن" ہو گی[2]۔ اب وہ رجوع تو نہیں کر سکتا مگر دوبارہ نیا نکاح کر سکتا ہے۔ اس دوسرے نکاح کے بعد اسے طلاق کا حق تین مرتبہ نہیں بلکہ صرف دو مرتبہ حاصل ہو گا لہٰذا اگر وہ اب طلاق دے اور رجوع نہ کرے اور عدّت گذر جائے تو یہ اس کی طرف سے دوسری طلاق بائن ہو گی۔ اس کے بعد وہ پھر باہمی رضامندی سے نکاح کر سکتے ہیں یہ ان کا تیسرا نکاح ہو گا جس کے نتیجہ میں صرف ایک باقی طلاق کا حق اسے ملے گا یعنی اگر وہ اب طلاق

---

[1] الحکم جلد ۷ ع۱۳ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء ص۱۴

[2] یا مثلاً قبل از رخصتانہ طلاق دے جو بائن ہوتی ہے۔

دے گا تو یہ اس کی "طلاق بتّہ" ہوگی اور دونوں میں قطعی جُدائی ہو جائے گی نہ رجوع ہو سکے گا اور نہ دوبارہ نکاح۔ گویا طلاق بتّہ کے واقع ہونے کے لئے دو طلاقوں کے درمیان یا تو رجوع حائل ہونا چاہیئے یا دوسرا نکاح۔ اگر ان دونوں صورتوں میں سے کوئی بھی صورت نہیں تو خواہ کتنی بار وہ مُنہ سے طلاق کا لفظ بولے طلاق ایک ہی متصوّر ہوگی۔ اِس مسلک کو فقہاءِ سلف میں سے بھی بعض (مثلاً امام شوکانی وغیرہ نے) تسلیم کیا ہے اور اسے "طلاق مغلّظہ" کا نام دیا ہے [۱]

طلاق بتّہ کے بارہ میں یہ نظریہ اگرچہ فقہائے احناف کے مسلک کے خلاف ہے لیکن فقہ احمدیہ آیاتِ قرآنی اور احادیث الرسول ؐ اور بعض ائمہ سلف ؒ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور آپ کے جانشینوں [۲] کے احکام کی روشنی میں اِسی بات کی قائل ہے کہ طلاق بائن کے بعد فریقین آپس میں دوبارہ نکاح کرسکتے ہیں سوائے اس کے کہ طلاق تیسری مرتبہ بائن ہو جائے اور اسی کو "طلاق بتّہ" یا "طلاق

---

[۱] روضۃ الندیہ شرح الدرر البھیہ۔ کتاب الطلاق ص۲۱۲

[۲] سیدنا حضرت مصلح موعود لکھتے ہیں:-

"عام طور پر اس زمانہ کے علماء یہ سمجھتے ہیں کہ جس نے تین دفعہ طلاق کہہ دیا اس کی طلاق* بائن ہو جاتی ہے یعنی اس کی بیوی اس سے دوبارہ اس وقت تک شادی نہیں کرسکتی جب تک کسی اَور سے نکاح نہ کرے مگر یہ غلط ہے کیونکہ قرآن کریم میں صاف فرمایا گیا ہے "اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ" یعنی وہ طلاق جو بائن نہیں وہ دو دفعہ ہوسکتی ہے اِس طور پر کہ پہلے مرد طلاق دے پھر یا طلاق واپس لے لے اور رجوع کرے یا عدّت گذرنے دے اور نکاح کرے پھر ان بن کی صورت میں دوبارہ طلاق دے پس ایسی طلاق کا دو دفعہ ہونا تو قطعی طور ثابت ہے۔ پس ایک ہی دفعہ تین یا تین سے زیادہ بار طلاق کہہ دینے کو بائن قرار دینا قرآن کریم کے بالکل خلاف ہے طلاق وہی بائن ہوتی ہے کہ تین بار مذکورہ بالا طریق کے مطابق طلاق دے اور تین عدّتیں گزر جائیں اس صورت میں نکاح جائز نہیں جب تک کہ وہ عورت کسی اَور سے دوبارہ نکاح نہ کرے اور اس سے بھی اس کو طلاق نہ مل جائے لیکن ہمارے ملک میں یہ طلاق مذاق ہوگئی ہے اور اس کا علاج حلالہ جیسی گندی رسم نے نکالا گیا ہے۔"

(تفسیر صغیر زیر آیت سورہ بقرہ ۲۳۰ ایڈیشن ششم ص۵۵)

* اِس جگہ بائن کا لفظ بینونۃ کبریٰ یعنی طلاق بتّہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ بعد کی عبارت سے ظاہر ہے۔

مغلّظہ" کہا جاتا ہے اس کے بعد یہ دونوں مرد اور عورت باہمی رضامندی سے بھی آپس میں نکاح نہیں کر سکتے سوائے اس کے کہ "حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ" کی قرآنی شرط پوری ہو یعنی عورت اپنی مرضی سے کسی دوسرے شخص سے شادی کرے اور پھر خاوند کے فوت ہو جانے یا کسی اَور قدرتی وجہ[1] سے وہ عورت اس نکاح سے آزاد ہو جائے اور پھر وہ پہلے خاوند سے نکاح کرنے پر راضی ہو تو اس طرح یہ دونوں پھر سے میاں بیوی بن سکیں گے۔

---

[1] قدرتی وجہ کی شرط اس لئے بیان ہوئی ہے کہ حلالہ کے طریق کی خرابی اور اس کے بطلان کو واضح کیا جائے۔ "حلالہ" کا رواج بعض مسلمان فرقوں میں ہے اور اس کی صورت یہ بیان کی جاتی ہے کہ کسی شخص نے غصہ میں آکر یا ناسمجھی سے جلد بازی میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں اکٹھی دے دیں اس کے بعد دونوں پچھتائے اور آپس میں پھر سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا لیکن چونکہ ان فرقوں کے نزدیک طلاق بتّہ واقع ہو چکی ہے اور حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ کی شرط پوری کئے بغیر وہ آپس میں دوبارہ نکاح نہیں کر سکتے اس لئے کسی مرد کو تیار کیا جاتا ہے کہ وہ اس عورت سے نکاح کرے اور پھر مباشرت کے بعد اسے طلاق دے دے تاکہ وہ عورت اپنے پہلے خاوند سے نکاح کر سکے۔ اس مصنوعی اور بے شرمی کے طریق کی اسلام نے ہرگز اجازت نہیں دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لعن اللّٰہ المُحَلِّلَ والمحلَّل لہٗ۔ (ابوداؤد کتاب النکاح باب فی التحلیل ص۲۸۳)

خُلع

دفعہ نمبر ۳۶

اگر علیحدگی کا مطالبہ عورت کی طرف سے ہو اور وہ نکاح سے آزاد ہونے پر مُصِر ہو اور مرد طلاق دینے سے اِنکار کرے تو عورت اپنے حق مہر یا دیگر مالی منفعت کے عوض قاضی کے ذریعہ خلع حاصل کرسکتی ہے۔

تشریح :- خُلع کے بارہ میں قرآن مجید میں ارشاد ہے :۔

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ [1]

یعنی تمہیں اگر اندیشہ ہو کہ میاں بیوی کے کشیدہ تعلقات اب اِس مرحلہ پر پہنچ گئے ہیں کہ ان میں نباہ نہیں ہوسکے گا اور وہ دونوں حدود اللہ کو قائم نہیں رکھ سکیں گے اور عورت علیحدگی پر مُصِر اور فدیہ یعنی بدل خلع دینے پر آمادہ ہو تو بیوی کے بدل خلع دینے اور میاں کے لینے میں کوئی گناہ نہیں۔ تم انہیں اِس طرح علیحدہ ہونے کی اجازت دے دو۔

اِس فرمان کی مزید تشریح مختلف احادیث اور خلفائے راشدین کے عمل سے ہوتی ہے چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جمیلہ بنت سلول ؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ مجھے اپنے خاوند ثابت بن قیس کی دینداری اور خوش خلقی پر کوئی اِعتراض نہیں لیکن میری طبیعت

[1] سورۃ البقرہ آیت ۲۳۰۔

اس سے نہیں ملتی اور اِس وجہ سے مجھے اس سے سخت نفرت ہے۔ پس ایسے حالات میں مَیں اس کے حقوق ادا نہیں کرسکوں گی اور ناشکری کی مرتکب ہوں گی اِس لئے مجھے علیحدگی دلوائی جائے۔

آپ نے فرمایا کیا مہر میں لیا ہوُا باغ واپس کرنے کو تیار ہو۔ اس نے عرض کیا کہ ہاں یارسول اللہ بلکہ اس سے زیادہ بھی۔ آپ نے فرمایا مہر میں لیا ہوا باغیچہ واپس کر دو اس سے زیادہ نہیں[1]

مذکورہ بالا ارشاد سے خُلع کے سلسلہ میں حسبِ ذیل پہلو واضح ہوتے ہیں:۔

ا :۔ جس طرح طلاق کے ذریعہ میاں کو علیحدگی کا اِختیار حاصل ہے اسی طرح خلع کے ذریعہ بیوی کو علیحدگی طلب کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

ب :۔ خلع کی صورت میں بیوی کی علیحدگی کے لئے ضروری ہے کہ وہ قاضی کے سامنے اپنا معاملہ پیش کرے اور اس کی مدد سے علیحدگی اختیار کرے۔

ج :۔ خلع کی صورت میں بیوی کو وہ مالی مفادات واپس کرنے ہوں گے جو وہ اپنے میاں سے حاصل کرچکی ہے اس کی واضح مثال مہر کی واپسی ہے۔

د:۔ میاں خواہ راضی ہو یا راضی نہ ہو بیوی کے اصرار کی صورت میں قاضی ان دونوں کے درمیان علیحدگی کا حکم صادر کرسکتا ہے ایسی علیحدگی کو خلع کہتے ہیں۔

ھ :۔ خلع کی عدّت صرف ایک حَیض ہے یا وضع حمل ہے[2]

و :۔ نفس خلع کے لحاظ سے عورت کو خلع طلب کرنے کا ایسا ہی حق ہے جیسا مرد کو طلاق دینے کا حق ہے۔ جس طرح کوئی شخص مرد کو طلاق دینے سے روک نہیں سکتا اسی طرح کوئی شخص عورت کو خلع لینے سے بھی نہیں روک سکتا۔

علامہ ابنِ رُشدؒ کا یہی مسلک تھا۔ چنانچہ وہ خلع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"خلع عورت کے اختیار میں ہے بمقابلہ مرد کے اختیارِ طلاق کے جس میں وہ مختار ہے۔ جب عورت کو مرد کی طرف سے کوئی تکلیف ہو اور اس وجہ سے وہ اسے ناپسند کرتی ہو تو وہ اپنے حق اختیارِ خلع کو اِستعمال کرکے علیحدگی حاصل کرسکتی ہے

---

[1] بخاری کتاب الطلاق باب الخلع جلد ۲ صفحہ ۷۹۴۔ ابن ماجه باب المختلعة تاخذ ما اعطاها صفحہ ۱۴۹۔ دارقطنی صفحہ ۳۹۷۔ نصب الرایه صفحہ ۲۴۵/۳۔

[2] تفصیل کے لئے دیکھیں دفعہ نمبر ۳۴۴ بحث عدّت۔

اس کے بالمقابل جب مرد کو عورت کی طرف سے تکلیف ہو اور وہ اسے نہ چاہتا ہو تو شارع نے اسے طلاق دینے کا اختیار دیا ہے۔" ؎

۲۔ خلع کے لئے بیوی کو اپنا معاملہ قاضی کے سامنے پیش کرنا ضروری ہے۔ اس کی حکمت یہ بھی ہے کہ شادی کے موقع پر خاوند کم وبیش بعض مالی ذمہ داریاں اُٹھاتا ہے اور بیوی یا اس کے والدین کے مطالبہ پر وہ بالعموم حق مہر کے علاوہ بھی زائد اخراجات برداشت کرتا ہے۔ اب اگر خاوند سے علیحدگی کے معاملہ میں عورت سراسر زیادتی کی مرتکب ہو رہی ہو اور خاوند کا کوئی قصور نہ ہو بلکہ وہ مظلوم ہو تو قاضی اِس بات کو زیرِ غور لا سکتا ہے کہ خاوند پر یہ ناواجب مالی بوجھ کیوں پڑے اور کیوں نہ مہر کے علاوہ زائد خرچ بھی عورت سے واپس دلوایا جائے۔

اِسی طرح اگر عورت مہر وصول کر چکی ہے تو اس کی واپسی کا معاملہ بھی قضاء یا عدالت حل کر سکتی ہے۔ لیکن اگر خلع کے ذریعہ عورت کو بھی مرد کی طرح خود بخود علیحدگی کا اِختیار ہو اور قاضی سے فیصلہ حاصل کرنا ضروری نہ ہو تو مہر یا دوسری مالی ذمہ داریوں کے بارہ میں تنازعہ پیدا ہو سکتا ہے۔ نیز بعض اَوقات عورت اپنی ناسمجھی یا ناتجربہ کاری کی وجہ سے غلط بنیاد پر خلع کے لئے اصرار کر رہی ہوتی ہے جب معاملہ قاضی کے سامنے آئے گا تو قاضی کے لئے اس کو سمجھانے یا صورتِ حال واضح کرنے کا موقع میسّر آ سکتا ہے اور اِس بات کا بڑی حد تک اِمکان ہے کہ عورت سمجھ جائے اور علیحدگی تک نوبت نہ پہنچے لیکن اگر عورت خلع لینے پر مُصِر ہو اور سمجھانے کے باوجود اپنی ضِد پر قائم رہے تو قاضی اس کے مطالبہ پر علیحدگی کا فیصلہ تو صادر کر دے گا لیکن اگر وہ دیکھے گا کہ عورت ظلم کی مُرتکب ہو رہی ہے اور اس کا رویّہ جارحانہ ہے اور خاوند کا کوئی قصور نہیں تو وہ خلع کے فیصلہ کے ساتھ یہ شرط بھی عائد کر سکتا ہے کہ خاوند نے عورت یا اس کے والدین کے مطالبہ پر جو کچھ بھی خرچ کیا ہے وہ خاوند کو واپس کیا جائے۔

؎ لَمَّا جُعِلَ التَّطْلِيْقُ بِيَدِ الرَّجُلِ إِذَا فَرِكَ الْمَرْأَةَ جُعِلَ الْخُلْعُ بِيَدِ الْمَرْأَةِ إِذَا فَرِكَتِ الرَّجُلَ۔

(بدایۃ المجتہد کتاب النکاح الباب الثالث فی الْخُلْعِ ص۵۶ ج۲)

اور جب تک وہ واپس نہ ہو اس وقت تک خلع کا فیصلہ ملتوی رہے۔

۳۔ طلاق کی صورت میں خاوند حق مہر اور دیگر تحائف وغیرہ جو وہ دے چکا ہے واپس لینے کا مجاز نہیں ہوتا لیکن خلع کی صورت میں عورت کو اکثر وہ مالی مفادات چھوڑنے ہونگے یا واپس کرنے ہوں گے جو وہ خاوند سے حاصل کر چکی ہے۔ اس سلسلہ میں ثابت بن قیس کی بیوی کا واقعہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے جسے صحیح بخاری[1]، نسائی کے علاوہ دیگر متعدد محدثین نے بھی بیان کیا ہے۔

○

دفعہ نمبر ۳۷

خلع کے فیصلہ کے لئے قاضی کا صرف اِس قدر اطمینان کافی ہے کہ عورت خود اپنی آزادانہ رائے سے خلع چاہتی ہے۔ خلع کے مطالبہ کے لئے کسی اور وجہ کا اظہار یا ثبوت لازمی نہ ہوگا۔

تشریح:- وجوہاتِ خلع میں صرف یہ وجہ کافی ہے کہ عورت کہے کہ وہ اپنے خاوند کے پاس رہنا یا اگر رخصتانہ نہیں ہوا تو اس کے پاس جانا پسند نہیں کرتی اور اسے اپنے خاوند سے نفرت ہے۔ نفرت کی وجوہات ظاہر کرنے کی وہ پابند نہیں۔

صاحبِ نیل الاوطار احادیث خلع پر بحث کرتے ہوئے بطور خلاصہ لکھتے ہیں:-

ظَاهِرُ اَحَادِيْثِ الْبَابِ، اَنَّ مُجَرَّدَ وَجُوْدِ الشِّقَاقِ مِنْ قِبَلِ الْمَرْأَةِ كَافٍ فِيْ جَوَازِ الْخُلْعِ[2]

---

[1] بخاری کتاب الطلاق باب الخلع جلد ۲ صفحہ ۷۹۴

[2] نیل الاوطار کتاب الخلع صفحہ ۲۴۹ / ۶

یعنی احادیثِ خلع پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ جوازِ خلع کے لئے صرف یہ وجہ کافی ہے کہ میاں بیوی میں اِفتراق اور ناچاقی ہے اور وہ اب مل کر نہیں رہ سکتے۔

قضاء کی طرف سے بعض اَوقات خلع کی درخواست کے تسلیم کرنے میں جو بظاہر تردّد کیا جاتا ہے اس کا مقصد درحقیقت درخواستِ خلع کو رَدّ کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس سے صرف یہ کوشش مقصود ہوتی ہے کہ کسی طرح یہ رشتہ قائم رہے اور عورت خاوند کے ساتھ رہنے پر رضامند ہوجائے۔ جلد بازی، کِسی کے اُکسانے یا وقتی جذبات اس کی ضِد کا موجب نہ ہوں گویا صرف مصالحت کی اِمکانی حد تک کوشش کرنا مقصود ہے ورنہ مسئلہ کی شرعی حیثیت یہی ہے کہ عورت اگر کسی طرح بھی اپنے مطالبہ سے دستکش نہ ہو توپھر خلع منظور کئے بغیر چارہ نہیں۔

○

دفعہ نمبر ۳۸

اگر خاوند کے ظلم و تعدّی کی وجہ سے عورت خلع لینے پر مجبور ہوگئی ہو تو قاضی خلع کی صورت میں اسے اس کا حق مہر بھی دلوا سکتا ہے۔

تشریح:۔ جس طرح قاضی کو یہ اختیار ہے کہ وہ دیکھے کہ عورت کِسی کے اُکسانے کی وجہ سے خلع کی درخواست تو نہیں کر رہی یا عورت ظلم کی مرتکب تو نہیں ہو رہی اور اس کا رویّہ جارحانہ تو نہیں ہے اسی طرح قاضی کے لئے یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ کہیں خاوند عورت کو خلع لینے پر اِس غرض سے تو مجبور نہیں کر رہا کہ وہ مہر کی ذمہ داری سے بچ جائے گویا عورت کی بجائے خاوند کا رویّہ ظالمانہ اور جارحانہ ہے تو اس صورت میں قاضی کو یہ بھی اختیار ہوگا کہ وہ عورت کے مطالبۂ خلع کو منظور کرلے اور اس کے ساتھ خاوند سے اسے اس کا حق مہر بھی دلوائے۔ چنانچہ امام مالکؒ اِس صورتِ حال کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

اَلْمُفْتَدِيَةُ الَّتِيْ تَفْدِيْ مِنْ زَوْجِهَا اِنَّهٗ اِذَا عُلِمَ اَنَّ زَوْجَهَا اَضَرَّبِهَا

وَضَيَّقَ عَلَيْهَا وَعُلِمَ اَنَّهٗ ظَالِمٌ لَهَا مَضَى الطَّلَاقُ وَرُدَّ عَلَيْهَا مَالُهَا۔
قَالَ مَالِكٌ فَهٰذَا الَّذِىْ كُنْتُ اَسْمَعُ وَالَّذِىْ عَلَيْهِ اَمْرُ النَّاسِ عِنْدَنَا[1]

یعنی خلع لینے والی عورت کے متعلق اگر معلوم ہو کہ اس کے خاوند نے اسے دُکھ دیا ہے اور اسے خلع لینے پر مجبور کیا ہے اور یہ بات ثابت ہو جائے کہ خاوند اس پر ظلم کرتا رہا ہے تو قاضی کا فیصلۂ خلع نافذ ہوگا اور اس کا مال جو وہ خاوند کو ادا کر چکی ہے وہ بھی اسے واپس دلایا جائے گا۔

امام مالک کہتے ہیں کہ مَیں اپنے اساتذہ سے یہی سُنتا آیا ہوں اور اسی کے مطابق علماء مدینہ کا عمل درآمد ہے۔

اِس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ مرد کی طرف سے ظلم کی صورت میں نہ صرف یہ کہ مرد بدلِ خلع نہیں لے سکتا بلکہ اگر وہ کچھ دے چکا ہے تو اس کی واپسی کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتا۔ بہرحال قاضی کیلئے خلع کا فیصلہ کرتے وقت ظلم و تعدّی کے اس پہلو کو بھی مدِّنظر رکھنا ضروری ہے۔

○

دفعہ نمبر ۳۹

خلع طلاق بائن کے حکم میں ہے یعنی فیصلۂ خلع کے بعد خاوند رجوع تو نہیں کر سکتا مگر فریقین باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔

تشریح:- جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے خلع ان معنوں میں فسخ نکاح ہے کہ خلع میں خاوند کی رضامندی ضروری نہیں ہوتی۔ بیوی کی طرف سے اظہارِ نفرت اور علیحدگی کے اصرار کی بناء اور بدلِ خلع کی ادائیگی کی شرط پر قاضی دونوں کے درمیان علیحدگی کا فیصلہ صادر کرتا ہے۔ پس جب قاضی خلع کا فیصلہ صادر

---

[1] مؤطا امام مالک کتاب الطلاق ماجاء فی الخلع

کر دیتا ہے تو اس کے بعد خاوند کے رجوع کا اختیار ساقط ہو جاتا ہے۔

صاحبِ ہدایہ نے اس کی حکمت کو اِن الفاظ میں بیان فرمایا ہے:۔

وَكَانَ الطَّلَاقُ بَائِنًا لِأَنَّهُ مُعَاوِضَةُ الْمَالِ بِالنَّفْسِ وَقَدْ مَلَكَ الزَّوْجُ أَحَدَ الْبَدَلَيْنِ فَتَمْلِكُ هِيَ الْآخَرَ وَهُوَ النَّفْسُ تَحْقِيقًا لِلْمُسَاوَاةِ [1]

یعنی بدلِ خلع کی ادائیگی کی شرط پر یہ علیحدگی طلاق بائن کے حکم میں ہوگی کیونکہ اس میں نفس کے بدلہ میں مال بطور معاوضہ ادا کیا جاتا ہے۔ پس جب خاوند دو چیزوں میں سے ایک کا مالک ہو گیا یعنی مال کا، تو عورت دوسری چیز کی مالک ہو گئی یعنی اپنے نفس کی، اور اس طرح ان دونوں کے درمیان مساوات کا اصول کارفرما ہوا۔

خیارِ بلوغ

دفعہ نمبر ۴۰

نابالغ لڑکی جس کے باپ یا ولیِ مجاز نے اس کا نکاح کر دیا ہو بالغ ہونے پر اس نکاح کو رَدّ کر دینے کا اختیار رکھتی ہے۔ اس اختیار کا نفاذ قاضی کے ذریعہ ہوگا۔

تشریح:۔ خیارِ بلوغ کا مسئلہ کسی نصِ صریح سے ثابت نہیں ہے بلکہ اس مسئلے کی بنیاد قیاس پر ہے جو فقہ احمدیہ کا ایک مسلمہ مأخذ ہے۔ جہاں تک قرآن و حدیث کا تعلق ہے کوئی واضح نص اِس بارہ

---

[1] ھدایہ باب الخلع ص ۳۸۱ ج ۲

میں نہیں ملتی کہ کسی نابالغ لڑکی کا نکاح اس کی بلوغت کے بعد حقِ استرداد اِستعمال کرنے پر توڑ دیا گیا ہو البتہ بالغ لڑکی کے نکاح کا ایک واقعہ احادیث میں مذکور ہے کہ اس کے والد نے اس کا نکاح کر دیا تھا مگر اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں اِس نکاح کو پسند نہیں کرتی تو آپؐ نے اسے اختیار دیا کہ اگر وہ اسے پسند نہیں کرتی تو وہ اِس نکاح کو نامنظور کر دے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں :۔

اِنَّ جَارِيَةً بِكْرًا اَتَتْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَتْ اَنَّ اَبَاهَا زَوَّجَهَا وَهِيَ كَارِهَةٌ فَخَيَّرَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ [1]

یعنی ایک کنواری لڑکی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے عرض کی یا رسول اللہ اُس کے باپ نے اس کا نکاح کر دیا ہے اور وہ اسے ناپسند ہے اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اختیار دیا کہ وہ چاہے تو اس نکاح کو نامنظور کر دے۔

اِس واقعہ پر یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کے معاملہ میں لڑکی کی رضا کو بھی ضروری سمجھا ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ ایک نابالغ لڑکی کے نکاح کو جبکہ وہ بالغ ہونے کے بعد اسے رَدّ کرتی ہے جبراً قائم رکھا جائے چنانچہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے اپنے ایک قضائی فیصلہ میں یہ حکم صادر فرمایا :۔

”میرے نزدیک لڑکی کو شریعت نے رضا کا حق دیا ہے اور جب وہ بالغ ہو جائے اس وقت اس کا حق اس کو مل جائے گا۔ کوئی نکاح کرے۔ لڑکی بالغ ہو کر اس حق کو جو اسے خدا تعالیٰ نے اپنے رسول کی معرفت دیا ہے طلب کر سکتی ہے اور کوئی انسانی فقہ اس حق کو اس سے چھین نہیں سکتی۔ گو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اِس قسم کی روایات ثابت نہیں کہ نابالغ لڑکی کا نکاح ماں باپ نے کر دیا اور آپؐ نے لڑکی کی درخواست پر اسے توڑ دیا ہو، لیکن یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بالغ لڑکی کا نکاح اسکے باپ نے بلا اس کی اجازت کے کر دیا اور آپؐ نے اسے توڑ دیا۔ پس جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکی کی رضا کو ایسا ضروری سمجھا کہ اس کی فریاد پر باپ کے کئے

---

[1] ابوداؤد کتاب النکاح باب البکر یزوّجھا ابوھا صفحہ ۲۸۵

ہوئے نکاح کو توڑ دیا تو کوئی وجہ نہیں کہ اس حق کو نکاح نابالغی کی وجہ سے باطل کر دیا جائے۔" [1]

"خیارِ بلوغ کے حق کی بنیاد ہی یہ ہے کہ نکاح میں فریقین یعنی مرد و عورت دونوں کی رضا ضروری ہے اور نابالغ اپنی عدم بلوغت کی بناء پر رضا کا اہل نہیں ہے لہٰذا جب اسے اہلیت حاصل ہو جائے تو وہ حق جسے شریعت نے تسلیم کیا ہے اس کے استعمال کا اختیار اسے حاصل ہو جاتا ہے۔ بعض فقہاء نے خیارِ بلوغ کا حق صرف اس صورت میں تسلیم کیا ہے جب نابالغ کا نکاح باپ دادا کے علاوہ کسی اَور نے کروایا ہو مگر اِس تخصیص کی کوئی بنیاد یا معقول وجہ نہیں اگر نابالغ کے نکاح کو رَدّ کرنے کا اختیار بعد حصولِ بلوغت اِس وجہ سے ہے کہ نابالغی کی حالت میں وہ رضا کا اہل نہیں تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہی صورت باپ دادا کے کئے ہوئے نکاح میں خیارِ بلوغ کا باعث نہ بنے چنانچہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک خواہ باپ ہو یا دادا جب انہوں نے نکاح نامناسب مہر پر کیا ہو یا غیر کفو میں کر دیا ہو تو لڑکی بالغ ہونے پر خیارِ بلوغ کا حق استعمال کر سکتی ہے۔" [2]

فِقہ احمدیہ خیارِ بلوغ کے حق کو زیادہ وسیع طور پر تسلیم کرتی ہے۔ نابالغہ کا نکاح خواہ کسی نے کروایا ہو بالغ ہونے کے بعد وہ اسے رَدّ کر سکتی ہے۔ اِس بارہ میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کا ارشاد ہے:۔

"لڑکیوں کی شادی اس عمر میں جائز ہونی چاہیئے جبکہ وہ اپنے نفع اور نقصان کو سمجھ سکیں اور اِسلامی حکم یہی ہے کہ شادی عورت کی رضامندی کے ساتھ ہونی چاہیئے اور جب تک عورت اس عمر کو نہ پہنچ جائے کہ وہ اپنے نفع و نقصان کو سمجھ سکے اس وقت تک اس کی رضامندی بالکل دھوکہ ہے لیکن ہمارے مذہب نے اشد ضرورت کے وقت اِس بات کی اجازت دی ہے کہ چھوٹی عمر میں بھی لڑکی کی شادی کی جا سکتی ہے لیکن اس صورت میں لڑکی کو اختیار ہوگا کہ وہ بڑی ہو کر اگر اس شادی کو پسند نہیں کرتی تو مجسٹریٹ

---

[1] حضور کے قضائی فیصلے رجسٹر نمبر ۲ صفحہ ۱۵ دار القضاء ربوہ

[2] المبسوط صفحہ ۲۱۵ جلد ۴

کے پاس درخواست دے کر اس نکاح کو فسخ کرائے۔ عام طور پر باقی فقہائے اسلام اِس بات کے قائل ہیں کہ ایسا نکاح اگر باپ نے پڑھوایا ہو تو نکاح فسخ نہیں ہو سکتا لیکن ہماری جماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر صورت میں نکاح فسخ ہو سکتا ہے خواہ باپ نے کرایا ہو یا کسی اَور نے کیونکہ جب لڑکی کی رائے بلوغت میں باپ کی رائے پر مقدم سمجھی گئی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ باپ کے پڑھوائے ہوئے نکاح کے بعد جب لڑکی بالغ ہو تو اِس حقِ رضامندی کو اسے واپس نہ دیا جائے"۔ [۱]

خیارِ بلوغ اور قاضی کا فیصلہ

خیارِ بلوغ کے سلسلہ میں یہ سوال بڑا اہم ہے کہ نابالغ کے بالغ ہونے کے بعد خیارِ بلوغ کا حق استعمال کرنے کے ساتھ ہی نکاح فسخ ہو جاتا ہے یا عدالت کے باضابطہ فیصلہ کے ساتھ فسخ ہوتا ہے۔

جمہور فقہاء کے نزدیک خیارِ بلوغ کا حق استعمال کر لینے سے نکاح خود بخود فسخ نہیں ہوتا بلکہ اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک کہ عدالت اس کے فسخ کا حکم جاری نہ کر دے۔ امام سرخسیؒ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"فقہاء نے خیارِ بلوغ میں فسخ نکاح کے لئے عدالت کے حکم کی جو شرط لگائی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ لڑکی کا بلوغ کے بعد نکاح کو رَدّ کر دینا شوہر کے کئی نقصانات کا موجب بنتا ہے اور یہ امر قرینِ اِنصاف نہیں کہ ایک معاہدہ جو صحیح طور پر منعقد ہوا ہو اور اپنے اثرات و نتائج کے اِعتبار سے نافذ بھی ہو محض ایک فریق کے رَدّ کر دینے

[۱] الفضل ۲۲ر اکتوبر ۱۹۲۹ء

سے دوسرے فریق کے نقصان اُٹھانے کا مستوجب قرار پائے۔ اِس لئے ضرورت ہے کہ کوئی تیسرا شخص عورت اور مرد دونوں کے بیان لے اور اِس امر کا جائزہ لے کہ خیارِ بلوغ کا حق صحیح طور پر اور صحیح وقت پر اِستعمال کیا گیا ہے یا نہیں۔ نیز یہ کہ آیا فریقِ متعلقہ سے کوئی ایسا فعل تو سرزد نہیں ہؤا جس سے یہ ثابت ہو کہ بلوغ کے بعد لڑکی نے اس نکاح کو تسلیم کر لیا تھا یا اپنے اس حق سے وہ دستبردار ہو گئی تھی ظاہر ہے کہ اِن امور کا فیصلہ عدالت کر سکتی ہے کیونکہ عدالت ایک غیر جانبدار ادارہ ہے اور اِس امر کی از رُوئے قانون مجاز ہے کہ وہ حالات پیش آمدہ کا جائزہ لینے کے بعد اپنے فیصلہ سے کوئی ضرر کسی دوسرے شخص کے ذمّہ لازم کر دے۔" [1]

○

دفعہ نمبر ۱۴

خیارِ بلوغ کے حق کا اِستعمال بلوغت کے بعد معقول مدّت کے اندر جلد ہونا لازمی ہے۔

تشریح:- "بعض فقہاء نے خیارِ بلوغ کے اِستعمال کی مدّت میں بڑی سختی سے کام لیا ہے اُن کے نزدیک اگر کوئی نابالغ لڑکی اپنے ولی کے کرائے ہوئے نکاح کو ناپسند کرتی ہے تو اسے چاہیئے کہ بالغ ہونے کے فوراً بعد خیارِ بلوغ کا حق استعمال کرے یا اگر نکاح کا علم نہیں تھا تو بالغ ہونے اور نکاح کا علم ہونے کے فوراً بعد اِس حق کو اِستعمال کرے۔" [2]

فِقہ احمدیہ خیارِ بلوغ کے حق کو اِستعمال کرنے کی مدّت کو اہمیّت نہیں دیتی۔ چونکہ اصولی طور پر بالغ

---

[1] المبسوط کتاب النکاح باب نکاح الصغیر والصغیرۃ ص ۲۱۵ / ۴

[2] المبسوط ص ۲۱۲ / ۴

ہونے کے بعد اپنا نکاح رَدّ کرنے کا حق مسلّم ہے اِس لئے اس حق کو اوّلیت حاصل ہوگی اور مدّت کا معاملہ ثانوی امر ہوگا جس کا فیصلہ تنازعہ زیرِغور کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر کیا جائے گا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی فرماتے ہیں :۔

" یہ محض عقلی چیز ہے۔ عقلاً کسی لڑکی کے متعلق جتنا عرصہ ضروری سمجھا جائے گا اسکے لئے ہم خیارِ بلوغ کی وہی معیار قرار دیں گے۔ اس میں سالوں یا عمر کی تعیین نہیں کی جاسکتی۔ خیارِ بلوغ کی تشریح آنحضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو نہیں فرمائی گذشتہ فقہاء نے کی ہے اور چونکہ یہ تشریح فقہاء نے کی ہے اِس لئے ہر زمانہ کے فقہاء کو اختیار ہے کہ وہ اِس بارہ میں عقلی طور پر جو فیصلہ مناسب سمجھیں کریں۔ ایک وقت ایسا تھا جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اِردگرد صحابہؓ کی تمام جماعت رہتی تھی اور فتویٰ جماعت کے تمام افراد میں اُسی وقت پھیل جاتا تھا لیکن اب وہ زمانہ ہے کہ لوگ دینی مسائل سے اکثر ناواقف ہوتے ہیں اس ناواقفیت کی بناء پر جتنی دیر ضروری سمجھی جائے گی اس کو ملحوظ رکھنا پڑے گا کیونکہ دینی مسائل سے ناواقفیت خود اپنی ذات میں ایک ایسی چیز ہے جو فتویٰ کو بدل دیتی ہے۔" [1]

ایک اَور قضائی فیصلہ میں حضور فرماتے ہیں :۔

" اظہارِ نفرت نکاح کے بعد معقول طور پر قریب عرصہ میں ثابت ہے اور سوال صرف بہت قریب کا ہے تو میرے نزدیک ایسے مشکوک فرق کے لئے ہم عورت کے حق کو باطل نہیں کرسکتے خصوصاً جب کہ ہم دیکھتے کہ خیارِ بلوغ کا مسئلہ ایسا مسئلہ نہیں ہے جس سے عام طور پر لوگ واقف اور آگاہ ہوں ایسے مسائل کے متعلق قدرتی طور پر تردّد زیادہ ہوتا ہے۔" [2]

○

---

[1] الفضل ۳۱ر اکتوبر ۱۹۴۴ء

[2] حضور کے قضائی فیصلہ جات کا رجسٹر نمبر ۲ صـ۲۳ دارالقضاء ربوہ

فسخ نکاح

دفعہ نمبر ۴۲

عورت یا مرد کے مطالبہ پر مندرجہ ذیل وجوہات میں سے کسی ایک یا زائد وجوہ کی بناء پر قاضی میاں بیوی میں علیحدگی کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ اس طرز کی علیحدگی کو فقہ کی اِصطلاح میں فسخ کہتے ہیں۔

وجوہات فسخ گیارہ ہیں :-

۱ - خاوند مفقود الخبر ہو۔

۲ - خاوند غیر معمولی لمبے عرصہ کے لئے قید ہو۔

۳ - خاوند نامرد ہو۔

۴ - خاوند کسی متعدی بیماری میں مُبتلا ہو۔

۵ - خاوند دائم المریض ہو۔

۶ - خاوند نان ونفقہ دینے کا اہل نہ ہو یا قضائی فیصلہ کے باوجود نان ونفقہ ادا کرنے سے عملاً انکاری ہو۔

۷ - عورت اپنے حقِ بلوغ کو استعمال کرے۔

۸ - خاوند ایلاء یا ظہار کرے اور چار ماہ کی مدّت کے اندر اپنی قسم سے رجوع نہ کرے۔

۹ - نکاح فاسد ہوا اور وجۂ فساد دُور نہ ہوئی ہو خواہ کوئی فریق اِس بناء پر علیحدگی کیلئے رضامند ہو یا نہ ہو۔

۱۰ - خاوند اور بیوی میں لعان ہو۔

۱۱۔ عورت دائم المریض ہو یا کسی اَور وجہ سے وظیفۂ زوجیّت ادا کرنے کی اہل نہ ہو اور یہ ثابت ہو کہ یہ عیوب اس میں نکاح سے قبل پائے جاتے تھے۔

تشریح:۔ فسخ اور طلاق میں فرق یہ ہے کہ طلاق خاوند کی طرف سے دی جاتی ہے اِس صورت میں مہر بالعموم خاوند کے ذمہ واجب الادا ہوتا ہے اور اس کی عدّت تین حیض یا تین ماہ یا وضع حمل ہوتی ہے[1] لیکن فسخ کا تعلق خاوند کے ساتھ نہیں ہوتا بلکہ قاضی بیوی یا میاں یا کسی اَور کی درخواست پر علیحدگی کا فیصلہ دیتا ہے اور اس کی عدّت صرف ایک حیض یا ایک ماہ یا وضع حمل ہوتی ہے۔

فسخ کی بعض صورتوں میں عورت علیحدگی بھی حاصل کرتی ہے اور مہر کی حقدار بھی ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں خاوند مہر ادا کرنے کا ذمہ دار نہیں ہوتا مثلاً بیوی میں بعض ایسے جسمانی عوارض ہوں جو وظیفۂ زوجیّت کی ادائیگی میں مانع ہوں مثلاً رتق وغیرہ کی وجہ سے اگر نکاح فسخ ہو تو مرد مہر ادا کرنے کا ذمہ دار نہ ہو گا۔ اگر علیحدگی میں عورت کا کوئی قصور نہ ہو بلکہ مرد کے کسی جسمانی عیب یا نقص کی وجہ سے فسخ نکاح ہوا ہو تو مرد مہر ادا کرنے کا ذمہ دار ہو گا۔

فسخ نکاح کی صورت میں علیحدگی طلاقِ بائن کے حکم میں ہوتی ہے سوائے لعان کے کیونکہ اس صورت میں علیحدگی ایسی دائمی طلاق کے حکم میں ہوتی ہے جس کے بعد کسی صورت میں بھی دوبارہ نکاح جائز نہیں ہوتا۔

مذکورہ بالا وجوہاتِ فسخ میں سے بعض کی تشریحات درجِ ذیل ہیں:۔

۱۔ مفقود الخبر

اِس سلسلہ میں دو امور پر بحث کی جاتی ہے:۔

ا۔ مفقود الخبر کے ورثے کی تقسیم۔

ب۔ مفقود الخبر کی زوجہ کا کسی دوسرے شخص سے نکاح کرنا۔

زیرِ بحث "دفعہ" میں اِس وقت شِق "ب" مدِّنظر ہے۔ مفقود الخبر ہونے کی بناء پر فسخ نکاح کیلئے کسی مدّت کی تعیین کی کوئی نص موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے زمانہ کے حالات کے مطابق اندازے

[1] دیکھیں دفعہ نمبر ۴۳

سے مختلف مدتیں مقرر کی ہیں اور اِس بارے میں تفاوت یہاں تک پایا جاتا ہے کہ جہاں بعض فقہاء نے ایک سال کی مدت مقرر کی ہے وہاں بعض دوسرے فقہاء اس عرصۂ انتظار کو نوّے سال تک لے گئے ہیں[1]۔

موجودہ ترقی یافتہ ذرائع مواصلات کے پیشِ نظر فقہ احمدیہ کے مطابق خاوند کے مفقود الخبر ہونے کی بناء پر علیحدگی کے لئے کوئی خاص مدت مقرر کرنا ضروری نہیں تاہم احتیاط کے تقاضہ کے پیشِ نظر عدالت کی طرف سے کم ازکم دو سال کی مدت مقرر کر دی جائے تو مناسب ہوگا۔

بہرحال مناسب یہ ہے کہ آخری فیصلہ قاضی یا عدالتِ مجاز کے اختیار میں ہو۔ حالات کے مطابق جتنا عرصہ وہ مناسب خیال کرے اتنا عرصہ اِنتظار کے بعد مفقود الخبر کا نکاح منسوخ کر کے دوسری جگہ نکاح کرنے کی اجازت دے دے۔

۲۔ ایلاء اور ظہار

الف :- ایلاء یہ ہے کہ خاوند قسم کھالے کہ وہ عورت سے ازدواجی تعلقات قائم نہیں کرے گا۔ اس صورت میں مرد کو چار ماہ تک مہلت دی جائے گی کہ اس مدت کے دَوران وہ اپنی قسم[2] توڑ کر بیوی کے حقوقِ زوجیت ادا کرے ورنہ بیوی کو اختیار ہوگا کہ چار ماہ کی مدت گزرنے پر بذریعہ عدالت فسخ نکاح کا مطالبہ کرے۔

ب :- ظہار یہ ہے کہ مرد اپنی بیوی کو اپنی ماں کی طرح قرار دے۔ عرب اس کے لئے یہ محاورہ اِستعمال کرتے تھے " اَنْتِ عَلَیَّ کَظَھْرِ اُمِّیْ " ایسی صورت میں بھی خاوند کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ چار ماہ مدت کے اندر اپنی اس قسم کا کفارہ[3] ادا کر کے بیوی کے حقوق ادا کرے ورنہ چار ماہ کی

---

[1] الاسرۃ فی الشرع الاسلامی باب المفقود ص۱۳۵ مطبوعہ بیروت ۱۹۵۱ء مولفہ عمر فروخ۔
" جامع الضروریات لانواع المعاملات ص۴۶ مولفہ محمّد عبد الباقی الافغانی۔

[2] قسم توڑنے کا کفارہ دس مساکین کو کھانا کھلانا یا لباس پہنانا ہے اور اگر یہ نہ کرسکے تو تین روزے رکھنا ہے ایلاء کا ذکر قرآن کریم کی سورۃ البقرہ آیت نمبر ۲۲۷ میں ہے۔

[3] ظہار اور کفارہ کا ذکر قرآن کریم کی سورۃ مجادلہ آیت ۳ تا ۵ میں ہے اور اس کا کفارہ یہ ہے کہ تعلق زوجیت قائم کرنے سے پہلے خاوند مسلسل دو ماہ کے روزے رکھے اور اگر یہ نہ کرسکے تو ساٹھ مساکین کو کھانا کھلائے۔

مدّت گذرنے پر عورت کو اختیار ہوگا کہ وہ بذریعہ عدالت فسخ نکاح کا مطالبہ کرے۔

۳۔ مریضہ بیوی

بعض اوقات عورت میں کوئی ایسا عیب ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ وظیفۂ زوجیت کے ادا کرنے کی اہل نہیں ہوتی مثلاً وہ آتشک یا جذام کی مریضہ ہے، مُہلک تپ دِق میں مُبتلا ہے اس میں قرن[1] یا رتق کا عیب ہے اور نکاح کے وقت مرد کو عورت کے ان عیوب کا علم نہیں ہو سکا اس کا علم اسے شادی کے بعد ہوا اس صورت میں خاوند قاضی کے سامنے صورتِ حال بیان کر کے فسخ نکاح کا مطالبہ کر سکتا ہے۔
بے شک خاوند اپنی ایسی بیوی کو طلاق بھی دے سکتا ہے لیکن اس صورت میں اسے مہر ادا کرنا پڑے گا لیکن اگر وہ اس عذر کی بناء پر قاضی کے ذریعہ نکاح فسخ کرائے تو اسے مہر ادا نہیں کرنا پڑے گا۔

عدّت

دفعہ نمبر ۴۳

نکاح صحیح ہو یا فاسد جب وہ خلوتِ صحیحہ کے بعد کسی وجہ سے ختم ہو یا خاوند کی وفات ہو جائے تو اِس طرح نکاح کے ختم ہونے کے بعد عورت ایک مدّتِ معیّنہ گذارتی ہے اور اس عرصہ کو عدّت کہتے ہیں۔

---

[1] قرن: عورت کی شرمگاہ میں سینگ کی طرز کی اُبھری ہوئی ہڈی کا ہونا جس کی وجہ سے وہ جماع کے ناقابل ہوتی ہے۔
رتق: شرمگاہ کے اندرونی حصّہ کا مضبوط جھلّی کی وجہ سے بند ہو جانا۔ اِس وجہ سے بھی وہ جماع کے قابل نہیں رہتی۔

تشریح:۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَ اَحْصُوا الْعِدَّةَ ج وَ اتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۔ [۱]

یعنی اے نبی اور اس کے ماننے والو جب تم بیویوں کو طلاق دو تو ان کو مقررہ وقت کے مطابق طلاق دو اور طلاق کے بعد وقت عدّت کا اندازہ رکھو اور اللہ کا جو تمہارا رب ہے تقویٰ اختیار کرو۔

اسی طرح ایک اور جگہ عدّت کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:۔

وَ الْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۔ [۲]

یعنی جن عورتوں کو طلاق مل جائے وہ تین بار حیض آنے تک اپنے آپ کو روکے رکھیں۔

عدّت کے دوران نکاح کا معاملہ نہ کرنے کا حکم اس آیت سے بھی ثابت ہے:۔

وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۔ [۳]

یعنی جب تک عدت کا حکم اپنی میعاد کو نہ پہنچ جائے اس وقت تک تم نکاح باندھنے کا پختہ ارادہ نہ کرو۔

ا:۔ نکاح کے بعد اور خلوتِ صحیحہ سے پہلے اگر میاں بیوی میں طلاق، خلع یا فسخ کے ذریعہ جُدائی ہو گئی ہو تو عورت پر کوئی عدّت نہیں۔ وہ جُدائی کے بعد کسی وقت بھی دوسرے مرد سے نکاح کر سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:۔

اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۔ [۴]

یعنی جب تم مومن عورتوں سے شادی کرو پھر ان کے چھونے سے پہلے طلاق دے دو تو تم کو کوئی حق نہیں کہ ان سے عدّت کا مطالبہ کرو۔

ب:۔ نکاح صحیح ہو یا فاسد اگر اس کے بعد خلوتِ صحیحہ میسّر آ جائے اور پھر کسی وجہ سے جُدائی

---

[۱] سورۃ الطلاق آیت ۲ [۲] سورۃ البقرہ آیت ۲۲۹

[۳] سورۃ البقرہ آیت ۲۳۶ [۴] سورۃ الاحزاب آیت ۵۰

ہو تو عورت کے لئے عدت ضروری ہے[۱]
ج۔ اگر جدائی طلاق کے ذریعہ ہو تو عدت تین حیض ہے[۲]
د۔ اگر کسی عورت کو حیض نہیں آتا تو اس کی عدت تین قمری مہینے ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے:-
وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُھُنَّ ثَلٰثَۃُ اَشْھُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ ط[۳]
یعنی تمہاری بیویوں میں سے وہ عورتیں جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں اگر اُن کی عدت کے متعلق تمہیں شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور اسی طرح ان کی بھی جن کو حیض نہیں آرہا۔
ہ۔ اگر عورت حاملہ ہے تو اس کی عدت وضع حمل یعنی ولادت ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:-
وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُھُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَھُنَّ۔[۴]
یعنی جن عورتوں کو حمل ہو ان کی عدت وضع حمل تک ہے۔
سُئِلَ سُبَیْعَۃُ الْاَسْلَمِیَّۃُ کَیْفَ اَفْتَاھَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ اَفْتَانِیْ اِذَا وَضَعْتُ اَنْ اَنْکِحَ۔[۵]
یعنی سبیعہ اسلمیؓ جو عدت وفات گذار رہی تھی اور حاملہ تھی اس سے پوچھا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عدت کے بارہ میں انہیں کیا ارشاد فرمایا تو انہوں نے جواب دیا کہ آپؐ نے فرمایا جب بچہ پیدا ہو جائے تو تم نکاح کر سکتی ہو۔
امام شعرانیؒ لکھتے ہیں:-
اِتَّفَقَ الْاَئِمَّۃُ عَلٰی اَنَّ عِدَّۃَ الْحَامِلِ مُطْلَقًا بِالْوَضْعِ سَوَاءٌ الْمُتَوَفّٰی عَنْھَا زَوْجُھَا وَالْمُطَلَّقَۃُ۔[۶]

۱؎ سورۃ البقرہ آیت ۲۳۶ ۔ ۲؎ سورۃ البقرہ آیت ۲۲۹
۳،۴؎ سورۃ الطلاق آیت ۵
۵؎ مسلم کتاب الطلاق باب انقضاء عدۃ المتوفی عنھا زوجھا۔
۶؎ المیزان الکبریٰ للشعرانی ص ۱۳۵/۲ مصری۔

یعنی ائمہ مذاہب اِس بات پر متفق ہیں کہ حاملہ کی ہر قسم کی عدّت وضع حمل ہے۔

و۔ اگر جُدائی خلع یا تنسیخ نکاح کی صورت میں ہو تو عدّت ایک حَیض ہے اور اگر حَیض نہیں آتا تو عدّت ایک ماہ ہے اور اگر حاملہ ہے تو عدّت وضع حمل ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں :۔

عَنِ الرُّبَيِّعِ بنت معوذ بن عفرآءَ اَنَّهَا اخْتَلَعَتْ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَمَرَهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ تَعْتَدَّ بِحَيْضَةٍ۔ [1]

یعنی ربیعہ بنت معوذ کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اپنے خاوند سے خلع لیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا کہ وہ ایک حَیض عدّت گزاریں۔

ز۔ نکاح کے بعد اگر خاوند فوت ہو جائے تو عدّت وفات چار ماہ دس دن ہے اور اگر عورت حاملہ ہے تو اس کی عدّت وضع حمل ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے :۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ؕ [2]

یعنی تم میں سے جن لوگوں کی رُوح قبض کر لی جاتی ہے اور وہ اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ جاتے ہیں چاہیئے کہ وہ بیویاں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن تک روک رکھیں۔

اگر کوئی عورت عدّت طلاق یا عدّت فسخ گذار رہی ہو اور اس دَوران میں اس کا خاوند فوت ہو جائے تو اس عورت کی سابقہ عدّت ساقط ہو جائے گی اس کی بجائے اس کے لئے "عدّتِ وفات" گزارنا ضروری ہوگا اور وہ خاوند کی وراثت سے حصّہ پائے گی۔

عدّت کی خواہ کوئی صورت ہو اس کے دَوران نکاح جائز نہیں۔ اگر کوئی شخص لاعلمی کی وجہ سے عدّت کے دَوران نکاح کرے اور تعلقاتِ زوجیّت بھی قائم ہو جائیں تب بھی فریقین کے درمیان تفریق لازم ہوگی البتہ عدّت گزارنے کے بعد فریقین اگر چاہیں تو دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا مذہب یہی ہے کہ عدّت کے دَوران نکاح ہو جانے سے

---

[1] ترمذی کتاب النکاح باب الخلع ص۱۴۲ ج۱

[2] سورۃ البقرۃ : ۲۳۵

ابدی حرمت لازم نہیں آتی بلکہ تفریق کروا دینے اور عدّت گذرنے کے بعد دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے[1]۔ سوائے اس کے کہ مرد اور عورت نے عمدًا اِس طرح نکاح کیا ہو اور معاشرتی مصالح کا تقاضا ہو کہ انہیں بطور سزا باہمی نکاح کے حق سے محروم کر دیا جائے۔ جو نکاح دَوران عدّت کیا جائے وہ اپنے اثرات کے اعتبار سے نکاح فاسد کے حکم میں ہے۔ اِس بارہ میں ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں:-

رُفِعَ اِلیٰ عُمَرَ اِمْرَأَۃٌ تَزَوَّجَتْ فِی الْعِدَّۃِ فَضَرَبَھَا وَضَرَبَ زَوْجَھَا بِالْمِخْفَقَۃِ ضَرَبَاتٍ وَفَرَّقَ بَیْنَھُمَا ثُمَّ قَالَ اَیُّمَا امْرَأَۃٍ نَکَحَتْ فِیْ عِدَّتِھَا فَاِنْ کَانَ زَوْجُھَا الَّذِیْ تَزَوَّجَھَا لَمْ یَدْخُلْ بِھَا فُرِّقَ بَیْنَھُمَا وَاعْتَدَتْ بَقِیَّۃَ عِدَّتِھَا مِنَ الْاَوَّلِ ثُمَّ کَانَ الْاٰخَرُ خَاطِبًا مِنَ الْخُطَّابِ وَاِنْ کَانَ دَخَلَ بِھَا فُرِّقَ بَیْنَھُمَا ثُمَّ اعْتَدَّتْ بَقِیَّۃَ عِدَّتِھَا مِنَ الْاَوَّلِ ثُمَّ اعْتَدَّتْ مِنَ الْاٰخَرِ ثُمَّ لَا یَجْتَمِعَانِ اَبَدًا[2]

یعنی ایک عورت نے عدّت کے دَوران نکاح کر لیا۔ جب اس کی شکایت حضرت عمرؓ کو ملی تو انہوں نے مرد و عورت دونوں کو کوڑے لگوائے اور پھر فرمایا اگر تو اس نے مباشرت نہیں کی تو ان میں تفریق کروا دی جائے اور پھر عدّت کے بعد اگر یہ چاہیں تو نکاح کر سکتے ہیں اور اگر انہوں نے مباشرت کر لی ہے تو پھر دائمی تفریق ہوگی دونوں عدّتوں کے بعد بھی یہ نکاح نہیں کر سکیں گے۔

---

[1] بدایۃ المجتہد ج۲ ص۳۹
[2] مؤطا امام مالکؒ ص۱۹۴

نان ونفقہ

دفعہ نمبر ۴۴

خاوند اپنی بیوی کے نفقہ کا ذمّہ دار ہے سوائے اس کے کہ بیوی خاوند کی مرضی کے خلاف کسی شرعی عذر کے بغیر اس سے علیحدہ رہائش اختیار کرے اور نشوز کی مرتکب ہو۔

تشریح خاوند اپنی بیوی کے نان ونفقہ کا ذمّہ دار ہے اور یہ ذمہ داری قرآن کریم اور احادیث سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے :-

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ [1]

یعنی مرد اس فضیلت کے سبب سے جو اللہ نے ان میں سے بعض کو دوسروں پر دی ہے اور اس سبب سے کہ وہ اپنے مالوں میں سے عورتوں پر خرچ کرتے ہیں عورتوں پر نگران قرار دیئے گئے ہیں۔

احادیث [2] سے ثابت ہے کہ بیوی کے نان ونفقہ کے بارے میں خاوند کی ذمہ داری اس کی مالی حیثیّت کے مطابق ہے، تاہم نان ونفقہ کی یہ اصولی ذمہ داری خاوند کی مالی حیثیت سے قطع نظر قائم رہتی ہے جیساکہ ارشادِ خداوندی ہے :-

وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰهُ اللّٰهُ ۔ [3]

یعنی جو شخص تنگدست ہو تو اللہ تعالیٰ نے جتنا بھی اس کو دیا ہو وہ اس میں سے اپنی بیوی

---

[1] سورۃ النّساء : ۳۵   [2] بخاری کتاب النفقات ص۲۰۲

[3] سورۃ الطلاق : ۸

کو نفقہ دے۔

اگر کوئی شخص بیوی کے نان و نفقہ کی بالکل استطاعت نہیں رکھتا تو بیوی کے مطالبہ پر میاں بیوی میں تفریق کروائی جاسکتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے:-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِی الرَّجُلِ لَا یَجِدُ مَا یُنْفِقُ عَلٰی امْرَأَتِه قَالَ یُفَرَّقُ بَیْنَهُمَا۔[1]

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک تنگ دست شخص جو اپنی زوجہ کو خرچ دینے کی بالکل استطاعت نہیں رکھتا تھا اس کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کی بیوی کو حقِ علیحدگی حاصل ہے۔

خاوند پر بیوی کو نفقہ دینے کی ذمہ داری اصولی ہے بیوی کا صاحبِ جائیداد ہونا اس ضمن میں غیر متعلق ہے کیونکہ خاوند اپنی صاحبِ جائیداد بیوی کے نان و نفقہ کا بھی ذمہ دار ہے۔ نان و نفقہ سے مراد زمانہ کے دستور اور معروف طریق کے مطابق خوراک، لباس اور رہائش مہیّا کرنا اور علاج معالجہ کے اخراجات برداشت کرنا ہے۔

بیوی اگر بلا عذرِ شرعی خاوند سے علیحدگی اختیار کئے رکھے یا نشوز[2] اختیار کرے تو وہ نان و نفقہ کی حقدار نہیں رہتی۔

عذرِ شرعی سے مراد ایسا عذر ہے جسے شریعت تسلیم کرے مثلاً بیوی کا مہرِ معجّل طلب کرنا اور خاوند کا ادا نہ کرنا۔ ایسے ہی بیوی کی ایسی طبعی حالت جیسے حیض یا نفاس کے ایام ہیں جن کی وجہ سے وہ فرائضِ زوجیّت ادا کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ یہ سب امور خاوند سے علیحدگی اختیار کرنے کا شرعی عذر مہیّا کرتے ہیں۔ اِسی طرح خاوند کے جبر و تشدّد سے تنگ آکر مجبوراً علیحدگی اختیار کرنا یا کسی ایسی جائز شرط کی بناء پر علیحدگی اختیار کرنا جو بوقتِ نکاح طے ہو چکی ہو عذرِ شرعی کے ذیل میں آئے گا۔

پس اگر بیوی اِس قسم کے کسی عذرِ شرعی کی وجہ سے علیحدگی اختیار کرے تو وہ باوجود علیحدگی اختیار کرنے کے نان و نفقہ کی حقدار رہو گی۔

---

[1] دارقطنی بحوالہ نیل الاوطار کتاب النفقات باب اثبات الفرقۃ للمرأۃ اذا تعذرت النفقہ الخ جلد ۶ ص۳۲۴ و بحوالہ فتح القدیر ص۳۳/۳

[2] نشوز کے مفہوم کے لئے دیکھیں باب الطلاق ص۷۱

دفعہ نمبر ۴۵

نان ونفقہ ادا کرنے کی ذمّہ داری بصورت طلاق ایّامِ عدّت تک قائم رہتی ہے
اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:
اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ط [1]
یعنی مطلقہ عورتوں کے حق کو نہ بھولو ان کو وہیں رکھو جہاں تم اپنی طاقت کے مطابق رہتے ہو اور ان کو کسی قسم کا ضرر نہ دو اس طرح کہ ان کو تنگ کرکے گھر سے نکال دو۔

تشریح چونکہ عدّت کے دَوران خاوند اور بیوی کا تعلق اِس حد تک قائم رہتا ہے کہ خاوند عدّت کے دَوران رجوع کرسکتا ہے اور اگر طلاق بائن ہے تو بھی عورت عدّت کے دَوران کسی دوسری جگہ شادی نہیں کرسکتی اِس لئے عدّت کے عرصہ کے لئے خاوند پر بیوی کا نان ونفقہ واجب ہے اگرچہ بعض روایات اس کے خلاف بھی ہیں مگر احناف کے نزدیک یہ امر مسلّمہ ہے کہ اگر کوئی اپنی بیوی کو طلاق دے دے خواہ وہ رجعی ہو یا بائن مرد پر عدّت کے دَوران کا نان ونفقہ واجب ہے۔

اِس بارہ میں صاحبِ فتح القدیر لکھتے ہیں:-
اِذَا طَلَّقَ الرَّجُلُ امْرَأَتَهٗ فَلَهَا النَّفَقَةُ [2]
یعنی جب کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو وہ عدّت کے دَوران نفقہ لینے کی حقدار ہے۔

عدّتِ وفات کے ایّام میں بیوہ کا نفقہ حتماً واجب نہیں کیونکہ مَرنے والے کی اپنے مال پر ملکیّت ختم ہوجاتی ہے اور متوفی کا مال ترکہ کی صورت میں دیگر ورثاء کے پاس جاچکا ہوتا ہے اور بیوہ بھی اپنے حِصّہ کے مطابق ترکہ کی وارث ہوچکی ہوتی ہے البتہ جیسا کہ دفعہ نمبر ۴۶ سے ظاہر ہے بطورِ حُسنِ سلوک ایک سال تک رہائش مہیّا کرنے کی وصیّت کرنا ضروری ہے۔

---

[1] سورۃ الطلاق آیت ۷
[2] فتح القدیر صفحہ ۳۳۹ جلد ۳

دفعہ نمبر ۴۶

بیوہ عدتِ وفات اور اس کے بعد ایک سال تک اپنے مرحوم خاوند کے مکان میں سکونت کا حق رکھتی ہے خواہ وہ مکان ترکہ میں کسی دیگر وارث کے حصہ میں آیا ہو۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ [1]

یعنی تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ اپنی بیویوں کے حق میں ایک سال تک فائدہ پہنچانے یعنی ان کے گھروں سے نہ نکالنے کی وصیت کر جائیں لیکن اگر وہ خود بخود چلی جائیں تو وہ اپنے متعلق جو پسندیدہ بات کریں اس کا تمہیں کوئی گناہ نہیں اور اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔

سیّدنا حضرت مصلح موعود اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت احکامِ میراث کے ذریعہ منسوخ ہو گئی ہے مگر یہ بالکل غلط ہے۔ بیوہ کا اپنے خاوند کی جائیداد میں جو حصّہ رکھا گیا ہے اس کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں یہ ایک الگ حکم ہے جس میں جائیداد کے حصّہ کے علاوہ عورت کے لئے سال بھر کے نان ونفقہ اور رہائش کا انتظام ضروری قرار دیا گیا ہے..... یہ ان سے نیک سلوک کرنے کا ایک زائد حکم دیا گیا ہے۔" [2]

علامہ جصّاص اپنی مشہور کتاب احکام القرآن میں بیوہ کے نفقہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

رَوَى الشَّعْبِيُّ عَنْ عَلِيٍّ وَعَبْدِ اللّٰهِ قَالَا اِذَا مَاتَ عَنْهَا زَوْجُهَا فَنَفَقَتُهَا مِنْ جَمِيْعِ الْمَالِ۔ [3]

یعنی حضرت علیؓ اور عبداللہ بن عباسؓ دونوں نے کہا ہے بیوہ کا نفقہ (بطور احسان) کُل ترکہ سے ادا ہو گا۔

---

[1] سورۃ البقرہ آیت ۲۴۱ [2] تفسیر کبیر سورۃ البقرہ صفحہ ۵۴۲

[3] احکام القرآن للجصاص صفحہ ۴۹۸/۱ نیز دیکھیں قرطبی صفحہ ۲۲۸/۲ مطبوعہ مصر ۱۹۶۷ء

دفعہ نمبر ۴۷

باپ اپنی نابالغ اولاد کے نفقہ کا حسبِ استطاعت ذمّہ دار ہے۔

تشریح بچّہ کے نان ونفقہ کی قانونی ذمّہ داری باپ پر اسی صورت میں ہے جبکہ بچّہ خود صاحبِ جائیداد نہ ہو۔ اگر بچّے کے پاس وافر جائیداد ہو اور اس سے اس کے اخراجات بآسانی ادا ہو سکتے ہوں تو باپ اپنے پاس سے یہ اخراجات ادا کرنے کا قانوناً ذمّہ دار نہ ہو گا۔

○

ماں باپ کا نفقہ

دفعہ نمبر ۴۸

ماں یا باپ اگر ضرورت مند ہوں اور ان کی اپنی کوئی ایسی جائیداد نہ ہو جو ان کی کفالت کر سکے تو حسبِ حالات اور استطاعت بیٹا ان کے نان ونفقہ کا ذمّہ دار ہے۔

تشریح اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا[1]

یعنی اپنے والدین سے حسنِ سلوک کرنا اور ان کی ضرورتوں کا خیال رکھنا اولاد کی ذمّہ داری ہے۔

---

[1] سُورۃ الاحقاف آیت ۱۶

حضانت

تمہید بچّوں کی نگہداشت و پرورش عائلی زندگی کا اہم حصّہ ہے۔ عام حالات میں ماں اور باپ دونوں مشترکہ طور پر بچّے کی نگہداشت کے ذمّہ دار ہوتے ہیں لیکن اگر بدقسمتی سے دونوں میں اختلاف پیدا ہو جائے اور نوبت طلاق، خلع یا علیحدگی تک پہنچے تو ایسی صورت میں کمسن بچّوں کی پرورش ایک معاشرتی مسئلہ بن جاتا ہے۔ شریعت نے ایسی صورتِ حال کے لئے بھی رہنما اصول مقرر کئے ہیں جن کی روشنی میں یہ طے کیا جائے گا کہ بچّہ ماں کے سپرد ہو یا باپ کے پاس رہے یا دیگر عزیز و اقارب کے پاس اور یہ بھی رہنمائی فرمائی کہ یہ حق کن رشتہ داروں کو کن پابندیوں کے ساتھ کس ترتیب سے اور کس حد تک حاصل ہوگا ان سب باتوں کی تفصیل آئندہ دفعات میں بیان ہوگی۔

○

حضانت کی تعریف

دفعہ نمبر ۴۹

بچّے کے سنِ تمیز کو پہنچنے تک اس کی پرورش، نگہداشت اور اس کو اپنے پاس رکھنے کا حق حقِ حضانت کہلاتا ہے۔

تشریح حضانت کا حق بچّے کے سنِ تمیز کو پہنچنے تک کے عرصہ کے لئے ایک عارضی حق ہے اور یہ والد کے حقِ ولایت سے مختلف نوعیّت رکھتا ہے جیسا کہ آئندہ دفعات سے ظاہر ہوگا یہ کسی طرح بھی والد کے حقِ ولایت سے متصادم یا اس سے بالا نہیں اور نہ ہی حضانت کسی اور کے پاس ہونے سے والد اپنی ذمّہ داریوں

سے آزاد ہو سکتا ہے۔ حضانت کا حق دراصل بچے کی بہبود کے پیشِ نظر نیز والدین کے جذباتی اور طبعی میلانات کو مدِ نظر رکھ کر قائم کیا گیا ہے اور یہ حق بچے کی رضاعت، جذباتی آسودگی، متوازن نشوونما اور اخلاقی و جسمانی تربیت کے تقاضوں کے مطابق قائم یا ساقط ہوتا ہے۔

مدتِ حضانت

دفعہ نمبر ۵۰

بچہ خواہ لڑکا ہو یا لڑکی اس کی حضانت کا حق اس کی عمر نو سال ہو جانے تک قائم رہے گا سوائے اس کے کہ یہ حق کسی وجہ سے اس سے قبل ساقط ہو جائے۔

تشریح

بعض فقہاء کے نزدیک لڑکے کے لئے حضانت کی عمر سات سال تک اور بعض کے نزدیک دو سال تک ہے۔ اسی طرح لڑکی کے لئے بعض فقہاء کے نزدیک عمرِ حضانت سات سال تک اور بعض کے نزدیک سنِ بلوغت تک ہے مگر فقہ احمدیہ کے مطابق ہر دو صورتوں میں یہ حق نو سال کی عمر تک قائم رہے گا اس کے بعد یہ حق ختم ہو جائے گا اور بچہ باپ کو لوٹا دیا جائے گا۔

دراصل شیر خوارگی اور اس کے معًا بعد کے دور میں بچے کی دیکھ بھال اور اس کی کمزور طبعی حالت کے پیشِ نظر بچے کی نشوونما کے لئے ماں ایک طبعی اور فطری مناسبت رکھتی ہے اور اس دور میں ماں کی گود بچے کی جذباتی آسودگی، صحت اور متوازن نشوونما کے لئے ضروری ہوتی ہے اسلئے اس دور میں بچہ کی بہبود کے پیشِ نظر ماں کے حق کو فائق تسلیم کیا گیا ہے مگر لڑکپن اور سنِ تمیز کو پہنچنے کے بعد بچے کی ذہنی، اخلاقی اور جسمانی تربیت کے تقاضے بدل جاتے ہیں جو باپ کی کفالت کے متقاضی ہیں اس لئے بچے کا باپ کو لوٹا دیا جانا ہی احسن ہے۔

اِستحقاقِ حضانت

دفعہ نمبر ۱۵

ا۔ حضانت کا حق والدین باہمی رضامندی سے متعیّن کر سکتے ہیں اور یہی طریقِ اولیٰ ہے۔

ب۔ اگر حضانت شق ا کے تحت طے نہ ہو سکے تو پھر یہ حق ثالث یا قاضی مندرجہ ذیل اصول کو سامنے رکھ کر متعیّن کرے گا۔ بشرط بہبودیٔ نابالغ۔ ماں حضانت کی اوّلین حقدار ہے۔ ماں کے بعد علی الترتیب نانی، دادی، پڑنانی، پڑدادی، بہن اور خالہ حضانت کی حقدار ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی موجود نہ ہو تو حقِ حضانت باپ اور باپ کی جانب سے دوسرے رشتہ داروں کو الاقرب فالاقرب کے اصول پر طے ہوگا۔

تشریح اگرچہ ماں کو حضانت کا اوّلین حقدار قرار دیا گیا ہے مگر یہ حق بچے کی بہبود کے تابع ہے اگر ماں اور دوسرے دعویدارانِ حضانت بچے کی بہبود کے لحاظ سے برابر ہوں تو پھر ماں ہی اوّلین حقدار ہے لیکن اگر بچے کا ماں کے پاس رہنا کسی وجہ سے اس کی بہبود کے خلاف ہو تو ماں کو یہ حق نہیں دیا جائے گا بلکہ متذکرہ ترتیب کے مطابق کسی اَور کو دے دیا جائے گا۔

○

اہلیّت حضانت

دفعہ نمبر ۵۲

حضانت کا اہل ہونے کے لئے لازمی ہے کہ حاضنہ یعنی جو حقِ حضانت حاصل کرنے کی دعویدار ہے وہ بچے کی نگہداشت کرسکتی ہو مریض نہ ہو، ناشزہ نہ ہو۔

تشریح بعض حالات میں ماں کے بعد بہن یا خالہ وغیرہ بچّے کی حضانت کی دعویدار ہوسکتی ہیں ایسی صورت میں بہن یا خالہ کا خود عاقلہ بالغہ اور بچّے کی نگہداشت کے قابل ہونا ضروری ہے۔ اِسی طرح حاضنہ اگر دائمی مریضہ ہو یا مجنون اور فاترالعقل ہو تو وہ بھی محض اُوپر دی گئی ترتیب میں قرابت کی وجہ سے حضانت کی حقدار نہیں ہو جائے گی۔

○

حضانت کے دوران نان نفقہ

دفعہ نمبر ۵۳

بچّے کی حضانت خواہ کسی کے پاس ہو عرصہ حضانت کے دَوران بچّے کا نان نفقہ باپ کے ذمّہ ہوگا۔

تشریح بچّہ کا نان ونفقہ بوجہ ولایت ذمّہ داری اور ثبوت نسل باپ کے ذمّہ ہوتا ہے اور اس کی یہ ذمّہ داری عمومی ہے۔ باپ کے علاوہ کسی دوسرے کی نگرانی میں رہنے کی وجہ سے یہ ذمّہ داری ختم نہیں

ہوتی جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ[1] کہ جس کا بچّہ ہے وہ بچّہ کی پرورش کے اخراجات ادا کرنے کا ذمّہ دار ہے۔

○

حدودِ حضانت

دفعہ نمبر ۵۴

حضانت کا حق باپ کے حقِ ولایت کے تابع ہے۔

تشریح بچّے کا قانونی اور شرعی ولی اس کا باپ ہے ماں بچّے کی ولیہ نہیں اِس لئے حضانت کے دَوران بھی بچّے پر باپ کی ولایت کا حق قائم رہتا ہے اور حاضنہ خواہ ماں ہو یا کوئی اَور بچّے کی پرورش اس کی تعلیم، دینی تربیت اور اس کی نشست و برخواست کے سلسلہ میں باپ کی معروف ہدایات کی پابند ہوگی۔

○

سقوطِ حضانت

دفعہ نمبر ۵۵

حقِ حضانت حاصل ہو جانے کے بعد حاضنہ کے حالات کی تبدیلی سے یہ

---

[1] سورۃ البقرہ آیت ۲۳۴

حق ساقط ہو سکتا ہے ایسی صورت میں حقِ حضانت از سرِ نو متعیّن کیا جائیگا۔

تشریح جیسا کہ بیان ہو چکا ہے حقِ حضانت ایک عارضی حق ہے اور محض بچّے کی بہبود اور بھلائی کے پیشِ نظر متعیّن کیا جاتا ہے اگر حضانت حاصل ہونے کے بعد کسی وقت بچّے کی بہبودی متأثر ہوتی ہے تو حقِ حضانت ساقط ہو جاتا ہے۔ مثلاً ماں اگر دوسری جگہ شادی کر لے تو اس کا حقِ حضانت متأثر ہو گا۔

بعض فقہاء کے نزدیک اگر ماں نے بچّے کے ذی محرم رشتہ دار سے شادی کی ہے تو حقِ حضانت قائم رہے گا اور اگر بچّہ کے غیر محرم سے شادی کی ہو تو حقِ حضانت ساقط ہو جائے گا۔

بعض فقہاء کے نزدیک دوسری شادی سے حقِ حضانت صرف اسی صورت میں ساقط ہوتا ہے جب دوسرا خاوند خواہ محرم ہو یا غیر محرم بچّے کی ذمّہ داری قبول کرنے کو تیار نہ ہو یا وہ بچّہ کا خیر خواہ نہ ہو ایک حدیث سے اس مؤقف کی تائید ہوتی ہے۔ ایک موقع پر حاضنہ جو کہ بچّے کی خالہ تھی اس نے بچّے کے غیر محرم سے شادی کی ہوئی تھی مگر اس کے باوجود آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے حضانت کا حق اس کی خالہ کو ہی دلایا کیونکہ اس کا خاوند بچّہ کی پرورش کی ذمّہ داری لینے پر تیار تھا بلکہ وہ یہ حق حاصل کرنے کا مطالبہ کر رہا تھا۔[1]

بہرحال ائمہ فقہ کا اختلاف ظاہر کرتا ہے کہ اصل معیار بچّے کی بہبود ہے۔ اگر ماں کی دوسری شادی سے بچّہ کی بہبود متأثر نہ ہوتی ہو اور سوتیلا باپ بچّے کی ذمّہ داری قبول کرنے کو تیار ہو تو یہ حق ساقط نہیں ہو گا۔

فقہ احمدیہ بھی اسی مسلک کو درست مانتی ہے اور قرار دیتی ہے کہ ماں کی دوسری شادی حقِ حضانت پر از سرِ نو غور کرنے کی وجہ تو بن سکتی ہے محض شادی سے حقِ حضانت ساقط نہیں ہو سکتا خواہ بچّہ کا یہ سوتیلا باپ اس کا محرم ہو یا غیر محرم۔

---

[1] نیل الاوطار باب من احق بکفالۃ الطفل ص ۳۲۸ ج ۶

خیار التمیز

دفعہ نمبر ۵۶

ا۔ سنِ تمیز کو پہنچنے کے بعد بچے کی اپنی مرضی کا استعمال خیار التمیز کہلاتا ہے۔
ب۔ بچے کا حقِ خیار التمیز بذریعہ قضاء نافذ ہوگا اور ہر صورت میں بچے کی بہبود کے تابع ہوگا۔
ج۔ ایسی صورت میں نان ونفقہ کی ذمہ داری کی تعیین قضاء کرے گی۔

تشریح بچے کی عمر نو سال ہو جانے پر حقِ حضانت ختم ہو جائے گا اور بچہ باپ کو لوٹا دیا جائے گا۔ البتہ اگر بچے کا مفاد تقاضا کرے اور بچے کی اپنی مرضی بھی حاضنہ کے پاس رہنے کی ہو تو بچے کو یہ اختیار دیا جا سکتا ہے کہ وہ جس کے پاس چاہے رہے البتہ بچے کا یہ اختیار قاضی کے فیصلہ کے تابع ہوگا اگر بچہ غلط نگران کو منتخب کرے تو بچے کی بہبود کے پیشِ نظر قاضی اس میں تبدیلی کر سکتا ہے۔ ایک ایسے ہی تنازعہ میں بچے نے باپ کے پاس رہنے کو ترجیح دی چھان بین پر معلوم ہوا کہ بچہ کھلنڈرا ہے اور ماں تعلیم پر زور دیتی ہے جبکہ باپ کو اس کی پرواہ نہیں اور اس وجہ سے بچہ باپ کے پاس جانے کو ترجیح دیتا ہے ایسی صورت میں قاضی نے بچہ کو ماں کے حوالے کر دیا[1]

۲۔ بچے کی عمر تمیز کو پہنچنے کے بعد جتنے معاملات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے خلفاءِ راشدین کے سامنے آئے اور جن کو تاریخ نے محفوظ رکھا ان سب میں ممیز بچے کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو باپ کے پاس رہے چاہے تو ماں کے پاس۔ ایسے واقعات کی نشاندہی کرنے کے بعد صاحب نیل الاوطار لکھتے ہیں:-

اَلظَّاهِرُ مِنْ اَحَادِيْثِ الْبَابِ اَنَّ التَّخْيِيْرَ فِىْ حَقِّ مَنْ بَلَغَ مِنَ الْاَوْلَادِ

---

[1] نیل الاوطار باب من احق بکفالة الطفل جلد ۶ صفحہ ۳۳۲

اِلیٰ سِنِّ التَّمْیِیْزِ هُوَ الْوَاجِبُ مِنْ غَیْرِ فَرْقٍ بَیْنَ الذَّکَرِ وَالْاُنْثیٰ [1]

یعنی حضانت سے متعلق جو احادیث مروی ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنِ تمیز کو پہنچنے والے بچے کو ماں باپ میں سے اپنا نگران منتخب کرنے کا اختیار دینا واجب ہے خواہ بچہ لڑکا ہو یا لڑکی۔

ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں:-

قِیْلَ اَنَّ التَّخْیِیْرَ اَوْلیٰ لِاِتِّفَاقِ اَلْفَاظِ الْاَحَادِیْثِ عَلَیْهِ وَعَمَلِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ۔ [2]

یعنی ممیز بچہ کو انتخاب کا اِختیار دینا زیادہ مناسب اور اولیٰ ہے کیونکہ احادیث کے الفاظ اور خلفاءِ راشدین کا عمل اس پر متفق ہیں۔

○

[1] [2] نیل الاوطار باب من احق بکفالۃ الطفل جلد ۶ صفحہ ۳۳۱

باب اوّل

وراثت کے مسائل

ترکہ کِسی شخص کی وفات پر اس کی تمام منقولہ وغیر منقولہ جائیداد ترکہ کہلاتی ہے۔

جب اِنسان فوت ہو جاتا ہے اور اپنا کچھ مال بطور ترکہ چھوڑ جاتا ہے تو اس ترکہ کو کیا کیا جائے یہ ایک عالمگیر سوال ہے مذاہبِ عالم نے اس کے مختلف جواب دیئے ہیں اِس سلسلہ میں اسلام نے جو جواب دیا ہے اس کا مختصر ذکر درج ذیل ہے:۔

تجہیز وتکفین، قرض اور وصیّت کی ادائیگی

جو ترکہ کسی متوفّی نے چھوڑا ہے اسے اس کے وارثوں میں تقسیم کرنے سے پہلے اس میں سے علی الترتیب مندرجہ ذیل ادائیگیاں کی جائیں گی :۔

۱ ۔ تجہیز وتکفین کے مصارف
۲ ۔ قرض کی ادائیگی
۳ ۔ وصیّت کی ادائیگی

میّت کے ترکہ میں سے سب سے پہلے اس کی تجہیز وتکفین کے اخراجات ادا کئے جائیں گے۔ تجہیز و تکفین سادہ معروف رنگ میں سُنّت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق کی جائے گی۔ اگر متوفّی کا ترکہ تجہیز وتکفین کے اخراجات کے لئے مکتفی نہ ہو تو حسبِ ضرورت یہ اخراجات بیت المال یا قومی مرکزی فنڈ سے ادا ہوں گے یعنی معاشرہ بحیثیت مجموعی ان اخراجات کا ذمّہ دار ہو گا۔

۲۔ قرض کی ادائیگی

اگر متوفّی کے ذمّہ قرض ہو تو تجہیز وتکفین کے اخراجات کے بعد جو کچھ باقی بچے اس میں سے سب سے پہلے قرض ادا کیا جائے گا۔ مہر بھی خاوند کے ذمّہ واجب الادا قرض ہے۔

۳۔ وصیّت کی ادائیگی

ا۔ وصیّت وہی درست ہے جو بقائمی ہوش و حواس ہو۔
ب۔ اگر متوفّی نے کوئی وصیّت کی ہو تو ادائیگی قرضہ کے بعد اور تقسیمِ ترکہ سے پہلے وہ وصیّت ادا ہوگی۔
ج۔ وصیّت زیادہ سے زیادہ ترکہ کے ایک تہائی حصّہ تک کی جا سکتی ہے۔
د۔ وارث کے حق میں وصیّت درست نہیں سوائے خاوند کے جو اپنی بیوی کی رہائش کے بارہ میں وصیّت کر سکتا ہے بلکہ ایسی وصیّت کرنا اس کے لئے ضروری ہے[1]

○

باب دوم

مانع میراث

ایسا امر جس کی بناء پر ایک شخص جو عام حالات میں وارث بننے کا حقدار ہو وراثت سے محروم ہو جاتا ہے مانع میراث کہلاتا ہے مثلاً

قتل:۔ قاتل اپنے مورث مقتول کے ترکہ کا وارث نہیں ہوگا کیونکہ حضرت ابوہریرۃؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَلْقَاتِلُ لَا یَرِثُ[2] کہ قاتل اپنے مقتول مورث کا وارث نہیں ہو سکتا۔

تشریح اِسلامی نظامِ وراثت کی بنیاد رحمی رشتے ہیں انہی کی بنیاد پر وراثت جاری ہوگی بشرطیکہ وارث اور مورث تناصر اور تضامن کے ایک سلسلہ میں منسلک ہوں چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

---

[1] سورۃ البقرہ آیت ۲۴۱ [2] ترمذی ابواب الفرائض

وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝[1]

یعنی بعض رحمی رشتہ دار اللہ کی کتاب کی رُو سے باہمی طور پر ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

ایک اَور موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓي اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝[2]

یعنی اللہ تم کو ان لوگوں سے نیکی کرنے اور عدل کا معاملہ کرنے سے نہیں روکتا جو تم سے دینی اختلاف کی وجہ سے نہیں لڑے اور جنہوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اللہ تم کو صرف ان لوگوں سے گہری دوستی رکھنے سے روکتا ہے جنہوں نے تم سے دینی اختلاف کی وجہ سے جنگ کی اور تم کو گھروں سے نکالا یا تمہارے نکالنے پر تمہارے دشمنوں کی مدد کی اور جو لوگ بھی ایسے لوگوں سے دوستی کریں وہ ظالم ہیں۔

ب :۔ فقہاءِ اسلام نے قتل کے علاوہ میراث کے بعض اَور موانع بھی بیان کئے ہیں مثلاً اختلافِ دین، اختلافِ دارین، کسی حادثہ میں ایک ساتھ فوت ہو جانا وغیرہ۔ لیکن ان اسباب کو مانع قرار دینے کی صحیح توجیہہ یہ ہے کہ بعض اوقات یہ اسباب موانع بن جاتے ہیں خصوصاً جبکہ اختلافِ دین کی وجہ سے باہم سخت دشمنی پیدا ہو جائے اور نوبت جنگ وجدال تک جا پہنچے۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں مختلف الدین افراد کی موالات یعنی باہمی دوستی کا معاہدہ اور ایک دوسرے کی نصرت جو باہمی میراث کی اہم بنیاد ہے کیسے قائم رہ سکتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ

"لَا يَتَوَارَثُ اَهْلُ الْمِلَّتَيْنِ شَتّٰى"[3] یعنی دینی اختلاف میں غلو کرنے والے جو تشتت اور

---

[1] سورۃ الانفال آیت ۷۶ [2] سورۃ الممتحنہ آیت ۹، ۱۰

[3] ابوداؤد کتاب الفرائض صفحہ ۴۷ جلد ۲

تمدّنی تعصب کا شکار ہو گئے ہوں وہ ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے۔ اِسی طرح حدیث لَا یَرِثُ الْمُسْلِمُ الْکَافِرَ وَلَا الْکَافِرُ الْمُسْلِمَ[1] کا مفہوم مذکورہ بالا آیاتِ قرآنی کی روشنی میں متعین ہوگا یعنی ایسے کافر جو محض مذہبی اختلاف کی بناء پر مسلمانوں سے جنگ کرتے ہیں اور ان کو ان کے گھروں سے نکالتے ہیں وہ اپنے مسلمان مورث کے وارث نہیں ہوں گے۔ ایسی ہی بنیاد کے پیشِ نظر حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے عہدِ حکومت میں یہ قانون نافذ کیا تھا کہ کوئی نومسلم اپنے غیر مسلم مورث کی وراثت سے محروم نہیں ہوگا[2]۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اختلافِ دین کا مانع وقتی اور بعض مصالح کی بناء پر ہے۔

یہی حال "اختلافِ دارین" کا ہے یعنی ایسے دو ممالک جو آپس میں برسرِ پیکار ہوں یا ان میں ایک دوسرے کے ملک میں ملکیّت حاصل کرنے کا کوئی باہمی معاہدہ نہ ہو اُن ملکوں کے افراد آپس میں رحمی رشتہ رکھنے کے باوجود ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے۔

حادثہ میں اس طرح اکٹھے فوت ہونے والے افراد کہ ان کی موت کے وقت کا علم نہ ہو سکے انکے ایک دوسرے کے وارث نہ بن سکنے کی بنیاد دراصل اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ کیا معلوم کون پہلے فوت ہوا ہے اور کون بعد میں لیکن فقہ احمدیہ اِس بارہ میں اِس اصول کو زیادہ صحیح مانتی ہے کہ حادثات میں ایک ساتھ فوت ہونے والے رشتہ داروں کی وراثت کا مسئلہ اِس طور سے طے کیا جائے کہ ان میں سے بڑی عمر والا پہلے فوت شدہ متصوّر ہو۔

---

[1] مسلمان اور کافر ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔ (ابوداؤد کتاب الفرائض ص۴۲)

[2] "نرث اهل الكتاب ولا يرثونا" (نیل الاوطار باب امتناع الارث باختلاف الدین ص۴۲)

باب سوم

اِصطلاحات

ذوی الفروض

ذوی الفروض سے مراد وہ وارث ہیں جن کے حصّے قرآن کریم میں معیّن کر دیئے گئے ہیں۔ مثلاً ماں، بیوی، خاوند وغیرہ۔

عصبات (عصبہ کی جمع)

عصبات سے مراد وہ وارث ہیں جن کا قرآن کریم نے کوئی حصّہ معیّن نہیں کیا بلکہ ذوی الفروض کو ان کے حصّے دینے کے بعد بقیہ تمام ترکہ ان کو مل جاتا ہے اور اگر کوئی ذو الفرض نہ ہو تو سارا ترکہ ان میں تقسیم ہوتا ہے مثلاً بیٹا، پوتا، باپ وغیرہ۔

عصبات کی اقسام

عصبہ کی تین قسمیں ہیں:۔

۱۔ عصبہ بنفسہٖ:۔ عصبہ بنفسہٖ سے میّت کا وہ رشتہ دار مراد ہے جس کا متوفّی سے تعلق براہِ راست ہو۔ عورت کے رشتہ کی وساطت نہ ہو مثلاً بیٹا، پوتا، باپ، دادا، بھائی، بھتیجا۔ اس کے بالمقابل نانا عصبہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ماں کے واسطہ سے رشتہ دار ہے اسی طرح نواسہ جس کا تعلق متوفّی سے بیٹی کے واسطہ سے ہے۔

۲۔ عصبہ بالغیر:۔ عصبہ بالغیر سے مراد متوفّی کی وہ رشتہ دار عورت ہے جو مرد کے واسطے سے عصبہ بنے۔ مثلاً بیٹی جو کہ بیٹے کی وجہ سے عصبہ بنتی ہے۔ پوتی جو کہ پوتے کی وجہ سے عصبہ بنتی ہے بہن حقیقی ہو یا علّاتی جو بھائی کی وجہ سے عصبہ بنتی ہے۔

۳۔ عصبہ مع الغیر:۔ متوفّی کی وہ عورت رشتہ دار جو کسی دوسری عورت کے واسطے سے

عصبہ بن جاتی ہے[1] مثلاً بہن جو متوفی کی بیٹی کے ساتھ مل کر عصبہ بن جاتی ہے۔

عصبات کی درجہ بندی

عصبات کی درجہ بندی "اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ" کے اصول کے تحت ہے یعنی جن رشتہ داروں کی قرابت متوفی سے زیادہ نزدیکی ہے وہ بوجہ عصبہ میراث میں مقدم ہوں گے اور نسبتاً دُور کے عصبات محجوب ہوں گے۔

باعتبار قُرب عصبات کی درجہ بندی حسبِ ذیل ہے:۔

ا۔ بیٹا، پوتا، پڑپوتا وغیرہ (یعنی متوفی کی نسل)

ب۔ باپ، دادا، پڑدادا (یعنی متوفی کی اصل)

ج۔ متوفی کا بھائی، بھائی کا بیٹا، بھائی کا پوتا (یعنی متوفی کے باپ کی نسل)

د۔ چچا، چچا کا بیٹا، چچا کا پوتا (یعنی متوفی کے دادا کی نسل)

عصبہ کا حقِ میراث اُس کی قِسم اور قرابت کے مطابق طے ہوگا مثلاً

مذکورہ بالا چار اقسام میں اگر قِسم اوّل کے عصبات موجود ہوں تو باقی قِسموں کے عصبات وارث نہیں ہوں گے۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس۔

اگر میراث سے حصّہ پانے والے عصبات مرد اور عورت دونوں ہوں یعنی عصبہ بنفسہٖ کے ساتھ عصبہ بالغیر بھی ہو تو پھر تقسیم "لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ"[2] کے اصول کے مطابق مرد کو عورت سے دوگنا ملے گا۔

ذوی الارحام

ذوی الارحام سے مراد وہ وارث ہیں جن کا شمار نہ تو ذوی الفروض میں ہوا اور نہ ہی عصبات میں بلکہ ان کی عدم موجودگی میں یہ وارث قرار پاتے ہیں مثلاً نواسہ، پھوپھی، خالہ، ماموں۔

---

[1] مثلاً ایک شخص فوت ہوتا ہے اس کے وارث ماں، بیٹی اور بہن ہیں ماں کو ترکہ کا ۱/۶ ملے گا بیٹی کو ترکہ کا ۱/۲ ملے گا اور بہن عصبہ ہو گی جسے ترکہ کا بقیہ حصّہ ملے گا۔

[2] سورۃ النساء: ۱۲

باب چہارم

ذوی الفروض کے حصّے

۱- والد

ا- اگر متوفّی کی اولاد ہو تو والد کو ترکہ کا ۱/۶ حصّہ ملے گا۔

ب- اگر متوفّی کی لڑکی یا لڑکیاں موجود ہوں تو والد بطور ذوی الفروض ۱/۶ حاصل کرے گا نیز دیگر ذوی الفروض کو ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ وہ بطور عصبہ حاصل کرے گا۔

ج- اگر متوفّی کی اولاد نہ ہو تو والد عصبہ ہوگا یعنی تمام موجود ذوی الفروض کو ان کے حصّے ادا کرنے کے بعد جو بچ رہے گا وہ والد حاصل کرے گا اور اگر کوئی ذوی الفروض نہ ہو تو سارا ترکہ والد کو مل جائے گا۔

۲- والدہ

ا- اگر متوفّی کی اولاد ہو تو والدہ کو ترکہ کا ۱/۶ حصّہ ملے گا۔

ب- اگر متوفّی کی اولاد نہ ہو لیکن میّت کے بہن بھائی ایک سے زائد ہوں تو بھی والدہ کو ترکہ کا ۱/۶ حصّہ ملے گا۔

ج- اگر متوفّی کی اولاد نہ ہو صرف والد اور والدہ ہوں اور کوئی بہن بھائی بھی نہ ہوں یا صرف ایک بہن یا بھائی ہو تو والدہ کو ترکہ کا ۱/۳ حصّہ ملے گا۔

د- اگر متوفّی کی اولاد یا بہن بھائیوں میں سے کوئی بھی موجود نہ ہو لیکن خاوند یا بیوی ہوں تو ان کا معیّن حصّہ ادا کرنے کے بعد والدہ کو باقی ترکہ کا ۱/۳ حصّہ ملے گا۔

۳- دادا

اگر متوفّی کا والد زندہ نہ ہو تو دادا کے حقوقِ میراث بعینہٖ وہی ہوں گے جو کہ والد کے ہیں

سوائے اس کے کہ متوفّی کی اگر ماں زندہ ہو تو ماں کو کُل ترکہ کا $\frac{1}{3}$ بطور ذی الفرض ملے گا اور دادا عصبہ ہو گا۔

۴۔ جدّات

اگر والدہ موجود نہ ہو تو دادی، نانی یا دونوں کو ترکہ کا $\frac{1}{6}$ حصّہ ملے گا۔

۵۔ بیٹی

ا۔ اگر متوفّی کی ایک بیٹی وارث ہو تو اس کو ترکہ کا $\frac{1}{2}$ حصّہ ملے گا۔
ب۔ اگر دو یا دو سے زیادہ بیٹیاں ہوں تو ان کو $\frac{2}{3}$ حصّہ ملے گا۔
ج۔ اگر متوفّی کی بیٹی کے علاوہ بیٹا بھی موجود ہو تو بیٹی عصبہ بالغیر ہو گی اور ترکہ ان کے درمیان ایک اور دو کی نسبت سے تقسیم ہو گا یعنی بیٹی کو ایک حصّہ اور بیٹے کو دو حصّے ملیں گے۔

۶۔ پوتی

ا۔ اگر متوفّی کی اولاد بیٹا، بیٹی زندہ نہ ہو تو پوتی وراثت میں بیٹی کے قائمقام ہوتی ہے۔ اگر ایک پوتی ہو تو اس کو ترکہ کا $\frac{1}{2}$ حصّہ ملے گا اگر دو یا دو سے زائد پوتیاں ہوں تو ان کو ترکہ کا $\frac{2}{3}$ حصّہ ملے گا۔
ب۔ اگر متوفّی کی ایک بیٹی اور ایک پوتی ہو تو پوتی کو ترکہ کا $\frac{1}{6}$ حصّہ ملے گا۔
ج۔ اگر متوفّی کی پوتی کے ساتھ پوتا یا پڑپوتا بھی موجود ہو تو سب عصبہ ہوں گے جن میں ترکہ "لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ" کے اصول کے تحت تقسیم ہو گا۔

۷۔ حقیقی بہن

ا۔ بہن بھائی تب وارث ہوتے ہیں جبکہ متوفّی بھائی کے نہ کوئی نرینہ اولاد ہو اور نہ اس کے باپ دادا زندہ ہوں یعنی نہ اس کی نرینہ اولاد ہو اور نہ اصل۔
بہرحال اگر متوفّی کی نرینہ اولاد یا باپ دادا موجود ہوں تو حقیقی بھائی بہن کو کچھ نہیں ملے گا۔
ب۔ اگر متوفّی کی اولاد یا باپ دادا بھائی میں سے کوئی موجود نہ ہو تو حقیقی بہن کو $\frac{1}{2}$ حصّہ ملے گا۔

ج۔ اگر دو یا دو سے زائد حقیقی بہنیں ہوں تو ان کو ترکہ کا $\frac{2}{3}$ حصّہ ملے گا۔

د۔ اگر متوفّی کی بیٹیاں یا پوتیاں ہوں تو حقیقی بہن عصبہ بن جائے گی یعنی ذوی الفروض کی ادائیگی کے بعد بقیہ ترکہ اس کو ملے گا۔

ہ۔ اگر متوفّی کے حقیقی بھائی بھی موجود ہوں تو پھر بہنوں اور بھائیوں میں بحیثیت عصبہ ترکہ ایک اور دو کی نسبت سے تقسیم ہوگا۔

۸۔ علّاتی بہن (دوسری والدہ سے بہن)

حقیقی بہن کی غیر موجودگی میں علّاتی بہن کا حقِ میراث وہی ہے جو کہ حقیقی بہن کا ہے۔

اگر متوفّی کی صرف ایک حقیقی بہن ہو تو علّاتی بہن کو کچھ نہیں ملے گا البتہ ان کے ساتھ اگر علّاتی بھائی موجود ہو تو علّاتی بہنیں بھی عصبہ بن جائیں گی اور ان سب میں بقیہ ترکہ ایک اور دو کی نسبت سے تقسیم ہوگا یعنی مرد کے دو حصّے اور عورت کا ایک حصّہ ہوگا۔

۹۔ خاوند

ا۔ اگر متوفیہ کی اولاد موجود ہو تو خاوند کو ترکہ کا $\frac{1}{4}$ حصّہ ملے گا۔

ب۔ اگر متوفیہ کی اولاد موجود نہ ہو تو خاوند کو ترکہ کا $\frac{1}{2}$ حصّہ ملے گا۔

۱۰۔ بیوی

ا۔ اگر متوفّی کی اولاد موجود ہو تو بیوی کو (ایک ہو یا زائد) ترکہ کا $\frac{1}{8}$ حصّہ ملے گا۔

ب۔ اگر اولاد موجود نہ ہو تو بیوی کو (ایک ہو یا زائد) ترکہ کا $\frac{1}{4}$ حصّہ ملے گا۔

اخیافی (مادری) بہن بھائی

اگر متوفّی کی نہ اولاد ہو نہ باپ دادا اور نہ ہی حقیقی یا علّاتی بھائی بہنیں ہوں تو اخیافی (مادری) بہن بھائی حسبِ ذیل طریق پر وارث ہوں گے:۔

ا۔ اگر متوفّی کا ایک اخیافی بھائی یا ایک اخیافی بہن ہو تو اس کو ترکہ کا $\frac{1}{6}$ حصّہ ملے گا۔

ب۔ اگر متوفّی کے دو یا دو سے زائد اخیافی بہن بھائی ہوں تو سب ترکہ کے $\frac{1}{3}$ میں بحصّہ برابر شریک ہوں گے۔

باب پنجم

عصبات کے حصّے

ا ۔ اگر ذوی الفروض موجود نہ ہوں تو کُل ترکہ عصبات کو ملتا ہے ۔
ب ۔ اگر ذوی الفروض موجود ہوں تو ان کے حصص کی ادائیگی کے بعد بقیہ عصبات کو ملتا ہے
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " اَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِاَھْلِھَا فَمَا بَقِیَ فَھُوَ لِاَوْلیٰ رَجُلٍ ذَکَرٍ "[1] یعنی پہلے ذوی الفروض کو ان کے حصّے دو اس کے بعد جو باقی بچے وہ متوفّی کے قریبی مرد رشتہ دار کو دو ۔

○

باب ششم

ذوی الارحام

ذوی الارحام سے مراد وہ رحمی رشتہ دار ہیں جن کا شمار نہ تو ذوی الفروض میں ہو اور نہ ہی عصبات میں مثلاً نواسہ ، نواسی ، بھانجا ، بھانجی ، پھوپھی ، خالہ ، نانا ، ماموں وغیرہ ۔
اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے :-

---

[1] صحیح بخاری کتاب الفرائض باب میراث الولد من ابیہ و امّہ جلد ثانی صـ ۹۹۷

ا ۔ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ [۱]

یعنی بعض رحمی رشتہ دار اللہ کی کتاب کی رُو سے باہمی رشتہ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے زیادہ قریبی ہوتے ہیں۔ اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

ب ۔ ایک اور جگہ فرمایا:۔

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا [۲]

اور جب ترکہ کی تقسیم کے وقت دوسرے قرابت دار اور یتیم اور مساکین بھی آجائیں تو اس میں سے کچھ انہیں بھی دے دو اور انہیں مناسب اور عمدہ باتیں کہو۔

اِن آیات سے اس استنباط کی تائید سُنّتِ رسولؐ اور احادیثِ نبویؐ سے بھی ہوتی ہے چنانچہ حضرت سعید بن منصور سے مروی ہے کہ

ثابت بن وحداحؓ جب فوت ہوئے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیس بن عاصمؓ سے دریافت فرمایا کہ اس کی نسبت تم جانتے ہو؟

قیس بن عاصمؓ نے کہا یہ ہم میں غیر تھا ہم صرف اس کے بھانجے کو پہچانتے ہیں وہ ابولبابہ بن منذر ہے۔ چنانچہ ثابت بن وحداحؓ کی میراث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بھانجے کو دلوا دی۔ [۳]

ایک اور حدیث ہے:۔

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ابْنُ اُخْتِ الْقَوْمِ مِنْ اَنْفُسِهِمْ ۔ [۴]

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قوم کا بھانجا انہیں میں سے ہوتا ہے (یعنی بھانجے کو حقِ میراث پہنچتا ہے)۔

د ۔ ایک اور روایت ہے:۔

اَلْخَالُ وَارِثُ مَنْ لَّا وَارِثَ لَهٗ [۵]

---

[۱] سورۃ الانفال آیت ۷۶ — [۲] سورۃ النساء آیت ۹ — [۳] شریفیہ شرح سراجی صفحہ ۱۱۱

[۴] صحیح بخاری کتاب الفرائض صفحہ ۹۹۶/۲ — [۵] ابنِ ماجہ کتاب الفرائض جلد ۱ صفحہ ۱۹۶

یعنی جس کا اَور کوئی وارث نہیں تو پھر اس کا وارث اس کا ماموں ہوتا ہے۔
پس قرآن پاک اور سُنّت وحدیث سے ثابت ہے کہ جب ذوی الفروض اور عصبات میں سے کوئی بھی موجود نہ ہو تو ترکہ ذوی الارحام میں تقسیم ہوتا ہے تاہم خاوند اور بیوی ذوی الارحام کی توریث میں روک نہیں۔ یعنی اگر خاوند یا بیوی زندہ ہو تو ان کی موجودگی میں ذوی الارحام کو باقی ترکہ ملے گا جبکہ دوسرے تمام ذوی الفروض ذوی الارحام کی توریث میں روک ہیں۔

○

ذوی الارحام کے درجے

عصبات کی طرح ذوی الارحام میں ترکہ کی تقسیم "اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ" کے اصول کے تحت ہو گی۔ ذوی الارحام کے چار درجے ہیں۔

۱۔ متوفّی کی اپنی اولاد (جو نہ ذوی الفروض میں سے ہو اور نہ عصبات میں سے) مثلاً نواسہ، نواسی اور پوتیوں کی اولاد۔

۲۔ متوفّی کی اصل یعنی آباؤ اجداد (جو نہ ذوی الفروض میں سے ہوں اور نہ عصبات میں سے) مثلاً نانا، باپ کا نانا، دادی کا باپ، ماں کا دادا وغیرہ۔

۳۔ متوفّی کے والدین کی اولاد (جو نہ ذوی الفروض میں سے ہو اور نہ عصبات میں سے) مثلاً بھانجا، بھانجی، بھتیجی وغیرہ۔

۴۔ متوفّی کے دادا اور نانی کی اولاد (جو نہ ذوی الفروض میں سے ہو اور نہ عصبات میں سے) مثلاً پھوپھی، ماموں، خالہ۔

پہلے درجے کے ذوی الارحام دوسرے، تیسرے اور چوتھے درجے کے ذوی الارحام پر مقدم ہوں گے۔ اِسی طرح اگر پہلے درجے میں کوئی بھی موجود نہ ہو تو دوسرے درجہ کے ذوی الارحام تیسرے اور چوتھے درجہ کے ذوی الارحام پر مقدم ہوں گے۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس۔

بابِ ہفتم

ردّ

بعض حالات میں ذوی الفروض کو اُن کے مقررہ حصّے ادا کرنے کے بعد کچھ ترکہ بچ جاتا ہے اور میّت کا کوئی عصبہ موجود نہیں ہوتا جو یہ بچا ہؤا ترکہ حاصل کرے چونکہ ذوی الارحام کو نسبی ذوی الفروض کی موجودگی میں حقِ میراث حاصل نہیں ہوتا اِس لئے ایسی صورت میں باقی ماندہ ترکہ نسبی ذوی الفروض کو ہی ان کے مقررہ حصّوں کی نسبت کے لحاظ سے لَوٹا دیا جاتا ہے اس طرزِ عمل کو رَدّ کہتے ہیں۔

نسبی ذوی الفروض یہ ہیں :-

والدہ، دادی، بیٹی، پوتی، حقیقی بہن، علّاتی بہن، اخیافی بھائی۔

اِس سے ظاہر ہے کہ خاوند یا بیوی کو بطریق ردّ زائد ترکہ نہیں ملے گا۔

○

بابِ ہشتم

عول

بعض دفعہ تقسیم ترکہ کے وقت ذوی الفروض اتنی تعداد میں موجود ہوتے ہیں کہ ان کے حِصّوں کا مجموعہ اکائی سے بڑھ جاتا ہے اور یہ صورت اس وقت پیش آتی ہے جبکہ میّت کے وارثوں میں کوئی بیٹا یا پوتا یا پڑپوتا وغیرہ موجود نہ ہو اگر یہ موجود ہوں تو ذوی الفروض کی تعداد یا تو گر جاتی ہے یا ان کے حصّے اس قدر کم ہو جاتے ہیں کہ ان کے حصّوں کا مجموعہ اکائی سے کم رہتا ہے اور اِس طرح ترکہ کا خاصہ حصّہ بچ جاتا ہے جو عصبات (بیٹا، پوتا یا پڑپوتا وغیرہ) کو ملتا ہے۔

ایسے حالات میں اگر ذوی الفروض کے حصّوں کا مجموعہ اکائی یا بالفاظِ دیگر نسب نما یا مخرج سے بڑھ جائے تو اس صورت میں تمام ترکہ کو ذوی الفروض کے حصّوں کے تناسب سے تقسیم کریں گے اِس طرح پر ذوی الفروض اپنے معیّن حصّے سے بحصہ رسدی قدرے کم حاصل کرے گا مثلاً ایک متوفیہ نے خاوند، دو حقیقی بہنیں اور ماں وارث چھوڑے۔ اُن کے مقررہ حصّے $\frac{1}{2}$، $\frac{2}{3}$ اور $\frac{1}{6}$ ہیں جن کا مجموعہ $\frac{8}{6}$ ہے جو اکائی سے بڑا ہے۔ اِس صورت میں ان کے حصّوں کا تناسب معلوم کریں گے جو $\frac{1}{2}$، $\frac{2}{3}$، $\frac{1}{6}$ کے لحاظ سے ۳، ۴، ۱ ہے۔ اِس طرح ترکہ کے کُل آٹھ حصّے کریں گے جن میں سے تین خاوند کو چار بہنوں کو اور ایک ماں کو ملے گا۔ اِس طریق سے ان کے حاصل کردہ حصّوں میں وہی نسبت قائم رہتی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے۔ اِس طریقِ عمل کو عول کہتے ہیں۔

○

باب نہم

حمل کی میراث

جنین اپنے وفات یافتہ مورث کا وارث ہے بشرطیکہ وہ زندہ پیدا ہو۔ پس اگر کوئی شخص فوت ہو جائے اور اس کی بیوی یا اس کے خاندان کی کوئی ایسی عورت حاملہ ہو جس کی اولاد کو میّت کے ترکہ میں سے حصہ پانے کا حق پہنچتا ہو تو ان حالات میں بہتر اور سہل صورت تو یہ ہے کہ وضع حمل کے بعد ہی ترکہ تقسیم کیا جائے لیکن اگر بعض ورثاء اِس اِنتظار میں کچھ حرج تنگی یا ڈر محسوس کریں کہ کہیں ترکہ ضائع نہ ہو جائے تو پھر موجودہ ورثاء قانوناً ترکہ تقسیم کروا سکتے ہیں۔ اِس صورتِ حال میں حسبِ ذیل دو سوال پیدا ہوتے ہیں:-

ا۔ وضع حمل کے لئے زیادہ سے زیادہ کتنا عرصہ اِنتظار کیا جائے۔

ب۔ اگر انتظار نہ کیا جا سکتا ہو اور ترکہ تقسیم کروانا مطلوب ہو تو ترکہ سے حمل کے لئے کتنا حصہ محفوظ رکھا جائے۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ عام حالات میں مدت حمل طبی شواہد کی بناء پر مقرر کی جائے گی[1]
دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ جو ترکہ بھی حمل کے لئے محفوظ رکھا جائے وہ بلحاظ تعداد و کیفیت زیادہ سے زیادہ امکان کو مدِ نظر رکھ کر محفوظ کیا جائے۔
وضع حمل کے بعد اگر محفوظ کئے ہوئے حصہ سے کچھ بچ جائے تو وہ وارثوں کو ان کے حصوں کی نسبت کے لحاظ سے لوٹا دیا جائے گا اور اگر محفوظ کیا ہوا حصہ کم ہو جائے تو ورثاء نو مولود وارث کو اس کے حصہ کے مطابق اپنے حاصل کردہ مال میں سے واپس کرنے کے ذمہ دار ہوں گے۔
اسی طرح اگر کسی وقت یہ ثابت ہو جائے کہ حمل نہیں تھا یا اسقاط ہو جائے یا بچہ مُردہ پیدا ہو تو محفوظ کیا گیا ترکہ ورثاء میں ان کے حصوں کی نسبت کے لحاظ سے تقسیم کر دیا جائے گا۔ اگر یہ ثابت ہو کہ بچہ کچھ دیر (یعنی چند لمحات) زندہ رہ کر فوت ہو گیا ہے تو اس صورت میں بچہ وارث ہوگا اور اس کا ترکہ اس کے وارثوں میں تقسیم ہوگا۔

○

باب دہم

حادثات

حادثات، آفاتِ سماوی یا جنگوں میں بظاہر ایک ساتھ فوت ہونے والے رشتہ داروں کا حکم۔
اگر کسی حادثہ میں ایک ساتھ بہت سے رشتہ دار فوت ہوں تو جو عمر میں بڑا تھا وہ پہلے فوت شدہ تسلیم کیا جائے گا۔ اس طرح وہ مورث ہوگا اور چھوٹی عمر کا وارث۔

---

[1] زیادہ سے زیادہ تین سو دن مدت حمل سمجھی جاتی ہے۔ برطانوی عدالت میں سب سے زیادہ لمبا عرصہ حمل ۳۴۹ دن تک مانا گیا ہے۔

A TEXT BOOK OF MID WIFERY BY THONSTON'S KEHER PAGE 110

نیز دیکھیں دفعہ نمبر ۲۳ مع تشریح۔

باب یازدہم

مفقود الخبر

مفقود الخبر کو میّت قرار دینے اور اس کی وفات کی تاریخ معین کرنے کا حق قاضی کو ہے جو حسبِ حالات فیصلہ کرے گا اور اسی کے مطابق وراثت اور دیگر شرعی احکام کا نفاذ ہوگا اس بارہ میں ملکی قانون کو بھی مدّ نظر رکھنا مناسب ہے[1]

○

باب دوازدہم

ولد الملاعنہ

اگر خاوند اور بیوی میں لعان ہوا اور قاضی کے فیصلہ کے نتیجہ میں بچہ ماں کی طرف منسوب ہو تو بچہ اور مزعومہ باپ ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے بلکہ یہ بچہ اور اس کی ماں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے۔

○

باب سیزدہم

یتیم پوتے یا نواسے کی میراث

کوئی نصِ صریح یتیم پوتے وغیرہ کی توریث یا عدم توریث کی موجود نہیں البتہ معروف تعامل ہمیشہ یہی رہا ہے کہ چچوں کی موجودگی میں یتیم پوتا وغیرہ اپنے دادا کا وارث نہیں ہوتا تاہم اگر قرآن مجید کے حکم وصیت پر عمل کیا جائے تو کوئی یتیم پوتا پوتی وغیرہ محروم الارث نہیں رہ سکتے اور اگر دادا کسی اتفاقی حادثہ کی وجہ سے وصیت نہ کر سکے تو قاضی[1] ترکہ تک ایسے یتامٰی کو دلا سکتا ہے بشرطیکہ دیگر ورثاء کو نقصان[2] نہ پہنچے۔

تمت بالخیر فالحمد للہ رب العٰلمین

---

[1] مزید تفصیل کے لئے دیکھئے بحث مفقود الخبر دفعہ نمبر ۴۲ ۔ [2] مثلاً اس کے باپ کو میراث میں سے جو حصہ ملتا وہ کم ہو اُس سے جو اُسے وصیت کی صورت میں مل رہا ہے۔ گویا اصول یہ ہوا کہ وصیت اس کے میراث کے حصہ سے زیادہ نہ ہو۔